U12770 18-12-07.

Title - SAWANEH AMEER MUNYAYEE.

Creator - Fasahat Jang Bahadur Jaleel.

Publisher - Matba Sayyedi Darul Shifa (Hyderabad)

Date - 1347 H

Pages - 80

Subjects - Ameer Munyayee - Sawaneh Mohd.
Tazkira Shora - Ameer Munyayee.

۷۸۶

سوانح امیر مینائی رح

(مولفہ)

استاذ السلطان جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

(جانشین امیر مینائی رح)

در مطبع سیدی دار الشفا حیدرآباد دکن طبع گردید

۱۳۴۷ھ

سوانح امیر مینائی رح

مؤلفہ

استاد السلطان جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

(جانشین امیر مینائی رح)

در مطبع سیدی دار الشفا حیدرآباد دکن طبع گردید

۱۳۴۷ھ
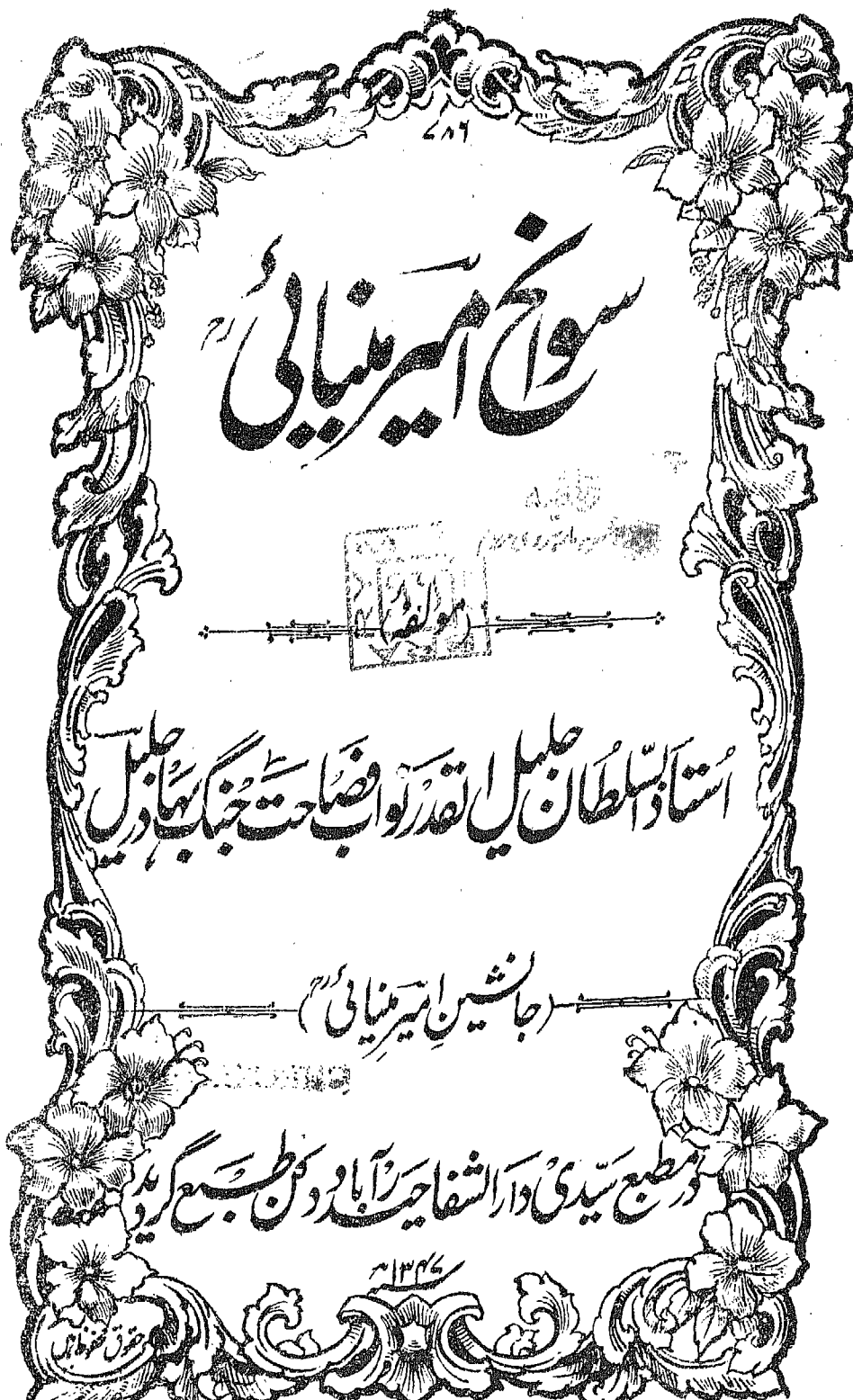
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

از نواب اختر یار جنگ بہادر اختر مینائی خلفِ حضرت امیر مینائی رح

اس زمانے میں واقعہ نگار اور سوانح و تذکرہ لکھنے والے اچھے اچھے لوگ ہیں اور بڑا کام کر رہے ہیں۔ آئے دن کتابیں دلچسپ عبارت میں خوشخط و خوشنما طبع ہو کر نکلتی ہیں جنکو دیکھکر آنکھیں روشن ہوتی ہیں مگر باایں ہمہ زیبائی و رعنائی ان تالیفات میں اثر نہیں ہے ایکبار دیکھنے کے بعد مشکل سے دوبارہ دیکھنے کی نوبت آتی ہے بخلاف اس کے قدیم تالیفات باوجودیکہ اُنکی عبارت میں کوئی رنگینی نہیں اثر سے لبریز ہیں بار بار دیکھنے جی نہیں بھرتا۔ اس تفاوت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگلے مولفین کی غرض و غایت تالیف سے محض اُس شخص کے حالات کا اظہار اور نمود ہوتی تھی جسکا وہ تذکرہ لکھتے تھے اور جدید مولفین کی غرض تالیف سے اپنی نمود ہوتی ہے کیونکہ قدم قدم پر اپنی معلومات کی نمایش میں زورِ قلم صرف کیا جاتا ہے۔

اس سوانح عمری میں جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل نے نہایت سادہ طور سے اپنے استاد حضرت والدی ماجدی امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ کے فضل و کمال کو اور اُن کے کلام کی منزلت کو ظاہر کیا ہے۔ کہیں نفسِ شاعری کی موشگافیوں اور اپنی واقفیت کے اظہار کی کوشش نہیں کی۔ نہ کسی شاعر پر رائے زنی کی نہ کسی کے کلام سے موازنہ کیا۔

بجز امیر و بجز خوبی کلام امیر
کسی کا ذکر نہیں ہے کسی کا نام نہیں

کسی شاعر کی سوانح عمری یا تذکرہ لکھنے میں حالات کیساتھ بڑا کام اسکے کلام کی فراہمی اور اُسکا انتخاب ہے۔ کیونکہ شاعر کی زندگی کا سرمایہ اور بقائے نام کا باعث صرف اُسکی تصنیف ہے۔ آج دنیا کی زبان پر سعدی رحمۃ اللہ علیہ و حافظ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات نہیں ہیں بلکہ اُنکا کلام ہے۔ لہٰذا بر آں جناب جلیل نے اس سوانح عمری میں زیادہ تر اہتمام انتخابِ کلام ہی کا کیا ہے اور یہی لُبِّ لباب حاصلِ کتاب ہے اور خوش نصیبی سے منتخب کلام اور چوٹی کے اشعار اس کثرت سے ملے ہیں کہ شاید ہی کسی مولف کو میسر ہوئے ہوں۔ منتخب کلام کی کثرت دیکھکے یہ گمان ہوتا ہے کہ مولف نے زیادہ شعر لئے ہیں لیکن چھوٹے ہوئے اشعار پر نظر کیجاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انتخاب میں کم اشعار لئے گئے ہیں۔

حضرت امیر کے سوانح اور لوگوں نے بھی لکھے ہیں مگر جناب جلیل کی کتاب ہر اعتبار سے مکمل و مستند ہے۔ انھوں نے حضرت امیر کا عمدہ کلام جس عنوان اور جس حسنِ ترتیب سے پیش کیا ہے یہ انھیں کا حصہ تھا

منتخب اشعار جنکو جواہر آبدار کہنا مبالغہ نہیں ہیں کثرت سے ہیں کہ اُن کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے جس مضمون کو دیکھئے اُسمیں دریا بہا دیا ہے اور ہر مضمون کا شعر ایک عالم رکھتا ہے مثلاً۔

رحمت عدالت پر غالب ہے

مرغِ عصیاں اُڑ کے صیدِ بازِ رحمت ہو گیا
ڈنگ شاہینِ ترازوے عدالت ہو گیا

قدِ بے سایہ

کھچا ایسا پری نقشِ سراپائے محمدؐ کا
کہ نقاشِ ازل نے آپ سایہ رکھ لیا قد کا

الف آدم میں ہی محمد و احمدؐ میں ہے بے مد کا
سبب یہ ہے کہ واں سایہ تھا یاں سایہ نہ تھا قد کا

شوقِ وصال

ہے وصل میں بھی شوق وہی وصل کا باقی
کہتا ہوں مدینے میں بھی میں ہائے مدینہ

بیخودی

سو جان سے اِس بیخودیِ شوق کے صدقے
جب آپ سے باہر ہوئے دیکھ آئے مدینہ

لذتِ دیدار

نظارہ کر کے رُخِ پاک کا جو پھرتی ہیں
بلائیں لیتی ہیں آنکھیں مری نگاہوں کی

نعت گوئی کی حقیقت

امیر اتنی حقیقت ہے ہماری نعت گوئی کی
ملا ہے مہرباں فریادرس فریاد کرتے ہیں

سخاوت

سخی ساتھ دنیا سے کیا لے گیا
مگر جو کسی کو دیا لے گیا

خدا کی راہ میں دینا ہے گھر کا بھر لینا
اِدھر دیا کہ اُدھر داخلِ خزانہ ہوا

قناعت

امیر پائے طلب جب سے توڑ کر بیٹھے کبھی نہ ہاتھ سوئے اغنیا بلند ہوا

اخلاق

کیسے ناداں ہیں جو اچھے کو برا کہتے ہیں ہو برا بھی تو اسے چاہیے اچھا کہنا

غربت

رہ گیا اپنے گلے میں ڈال کر بانہیں غریب عید کے دن جس کو غربت میں وطن یاد آگیا

عید ملنے کی رسم

رسم نے ملنے کی کھو دی عید کی ساری خوشی تین دن تک پاؤں رہ جاتے ہیں اٹھتے بیٹھتے

ہمت

بڑھا اے آہِ رسا اب کنگرۂ عرش پہ پہونچی بلندی کو بلندی جاننا ہمت کی پستی ہے

پیری

پیری میں ضعف سے یہ نہیں رعشہ دار ہاتھ ہیں دامن قضا کے لیے بیقرار ہاتھ

قدم کو لغزش زباں کو لکنت ہے رعشہ ہاتھوں میں سر کو جنبش کدھر گئی ہائے نوجوانی ان آفتوں میں مجھے پھنسا کر

زبان ضعف پیری میں چلتی رہی سحر ہو گئی شمع جلتی رہی

دنیا گزران ہے زندگانی فانی رباعی طفلی مہمان ہے نوجوانی فانی

پیری میں جو ہڈیاں چٹکتی ہیں امیر کانوں میں صدا آتی ہے فانی فانی

شرم گناہ

لذتِ شرم گنہ تھی کب فرشتوں کو نصیب یہ مزہ چکھنے کو پیدا حضرت آدم ہوا

لاغری

وہ ناتواں ہوں جو لیٹا کبھی میں بستر پہ / گماں ہوا کہ شکن پڑ گئی ہے چادر پہ

زرا ایسا میں ہوا باد پہ پیما ہو کر / ذرّہ چاہے تو تھکا دے مجھے صحرا ہو کر

لاغر ہوں اسقدر مجھے پہچانتی نہیں / رہ رہ کے دیکھتی ہی قضا سر سے پاؤں تک

ہوں وہ لاغر در پہ اسکے گر پڑا / کھا کے ٹھوکر سایۂ دیوار کی

عشق و محبت سوز و گداز حسرت و یاس

پہلو میں میرے دل کو نہ اے درد کر تلاش / مدت ہوئی غریب وطن سے نکل گیا

نہ گل ہنستے نہ غنچے مسکراتے دونوں روتے / تمہیں کو بلبلو آتا نہیں انداز شیون کا

کسی گنہ پہ کوئی قتل ہو میں کہتا ہوں / کہ اس سے جرم ہوا ہوگا آشنائی کا

اے جرس تو تو نہیں قافلے والوں سے جدا / تیری آواز میں یہ درد کہاں سے آیا

ہمارے رونے پہ آتی نہیں کسے رقت / حباب روتے ہیں آنکھوں پہ رکھکے دامن موج

سنا کسی سے جو نام دوائے درد جگر / تڑپ کے دل نے صدا دی کہ ہائے درد جگر

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی / یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں / پھر اسقدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

خون ناحق کہیں چھپتا ہے چھپائے سے امیر / کیوں مری لاش پہ بیٹھے ہیں وہ دامن ڈالے

گل نسیم سحری شمع سحر کو نہ کرے / کوئی دم میں یہ غریب آپ بجھی جاتی ہے

دل ہی نہ رہا امید کیسی / جب کٹ گئی نخل آرزو کی

پوچھتے ہیں جو شب ہجر میں ہم شمع سے حال / منہ سے کہتی نہیں کچھ اشک بہا دیتی ہے

نہ نظر آیا چارہ گر کے سامنے اے درد دل مجھکو / کہیں ایسا نہ ہو یہ بھی تقاضائے دوا ٹھہرے

رہ رہ کے اک کھٹک سی سینے میں ہو رہی ہے
شاید ابھی ہے باقی ٹکڑا کوئی جگر کا

کہتے تھے دل کسی سے لگاؤ نہ اے امیر
دیکھو تو چار روز میں کیا حال ہو گیا

غم اسکا حسرتوں سے پوچھتا ہے میرے سینے میں
کہاں ہے وہ جو دل نام اک یہاں بیمار رہتا تھا

بیقراری نے بدلوائی تو کروٹ بدلی
درد دل نے جو مدد کی تو میں بستر سے اٹھا

کرنے کو کیا قتل مجھے یار نے لیکن
رو رو کے مرے خون کو تلوار سے دھویا

ہزار طرح کے ہوتے ہیں وہم ہمکو امیر
کسی کی آنکھ جہاں ہم پر آب دیکھتے ہیں

کرتے ہیں جو لوگ ذکر ان کا
ایک ایک کا منہ میں دیکھتا ہوں

صیاد سے چھری کے تلے عندلیب نے
حسرت سے یہ کہا کہ غریب الوطن ہوں میں

آہ کس حسرت سے لیلیٰ نے کہا ہنگام نزع
سونپے جاتی ہوں تجھے ای بیکسی میں قیس کو

بسملوں سے بھی ناز اٹھوائے
ہائے انداز میرے قاتل کے

میں تو روتا ہوں اپنی قسمت کو
تو بتا ابر کس کو روتا ہے

فرقت میں میہمانیِ غم کیا کروں امیر
ٹکڑے ہیں کچھ جگر کے سو وہ بھی جلے ہوئے

کہا مجنوں نے شاید ناقۂ لیلیٰ ادھر آئے
میں اس امید پر چلتا ہوں کانٹے اس بیاباں کے

جو ہوش میں مجھے لانا ہے دوستو منظور
کہو کہ تجھکو ترے یار نے بلایا ہے

تم دکھاتے تو ہو اسیر کا دل
اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے

شور محشر اسیر کو نہ جگا
سو گیا ہے غریب سولے دے

آجتک گور میں لیلیٰ کو نہیں چین قرار
میرے مجنوں میرے مجنوں کی صدا آتی ہے

کس نگہ سے تم نے دیکھا تھا امیر
روتے روتے ان کو ہچکی لگ گئی

آپ ہی جل رہے ہیں پروانے
شمع کی سرگذشت کون سنے

وہ مزہ دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
مرے دونوں پہلوؤں میں دل بیقرار ہوتا

مرے دل کو یوں مٹایا کہ نشاں تک نہ رکھا
میں لپٹ کے رو تو لیتا جو کہیں مزار ہوتا

پھر بیٹھے بیٹھے وعدۂ وصل اس نے کر لیا
پھر اٹھ کھڑا ہوا وہی روگ انتظار کا

پھنسی ہے دام میں بلبل تو کن نگاہوں سے
کبھی چمن کو کبھی سوئے آشیاں دیکھا

ہمیں اے باغباں غنچوں سے کیا کام
ہم اپنا دل چمن میں ڈھونڈتے ہیں

اے اہلِ بزم مجھکو اٹھاؤ نہ بزم سے
شمعِ سحر ہوں عمر بپایاں رسیدہ ہوں

کبھی مد نظر گر عاشقوں کا قتل ہو تم کو
ہمیں بھی یاد رکھنا ہم بھی تمکو پیار کرتے ہیں

ملا کر خاک میں بھی ہائے شرم انکی نہیں جاتی
نگہ نیچی کیے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں

آ کے تربت پہ مری کہتے ہیں لو اٹھ بیٹھو
اب تو مدت ہوئی ہم تمکو ستاتے بھی نہیں

اسیر ایسی کہاں قسمت کہ پہنچوں اڑکے پھولوں تک
کبھی جا کے قفس ہی جھانک لیتا ہوں گلستاں کو

تجھ سے اے بادِ صبا مجھکو یہ امید نہ تھی
چار پھولوں کو ترس جائیگی تربت میری

یاد آتا ہوں کبھی میں تو پہن لیتے ہیں
ایک جوڑا مرے پھولوں میں بسا رکھا ہے

بولے حسرت سے وہ تابوت کو کاندھا دیکر
بوجھ اٹھواتے ہیں اب ناز اٹھانے والے

میں ہوں وہ کعبہ نشیں جا کے دیر کے در پہ
پکارتا ہوں کوئی بت خدا کی راہ ملے

موت آئے یا وہ آئے یا قیامت ہو اسیر
اب یہی دو تین جینے کے سہارے رہ گئے

رتبہ شہیدِ عشق کا گر جان جائیے
قربان ہونے والے پہ قربان جائیے

ستم ہے تیر بے ہوتے آپ پیکاں
مرا دل ہو نہ پھر پانی کو ترسے

خود ترے ہونٹ پہ کہتے ہیں کہ بوسہ لیلو
اور معشوقوں کی ہوتی ہے اجازت کیسی

زیست کا لطف تو یاروں ہی کے دم سے اسیر
بیٹھ جاتا ہے دل احباب کے اٹھ جانے سے

شبِ غم مجھ سے بیٹھا جائے کیونکر
تری تصویر تو آگے کھڑی ہے

کھا کے تلوار جو قاتل کی فغاں کرتا ہوں
لذتِ زخم رقیبوں سے نہاں کرتا ہوں

بعدِ مرگ آئے ہیں وہ تربت پر
اب کہاں جان جو نثار کروں

ٹھہر ٹھہر کے ذرا لیجیو مرا تابوت
کہاں امید کہ پھر آؤں کوئے قاتل میں

پہلے زلفوں کو سنگھا کر مجھے بیہوش کرو
پھر مرے سینے سے تم تیر کا پیکاں کھینچو

اسلئے در پر صدا دیتا ہوں میں
بول اٹھے شاید وہ اتنا کون ہے

فرقت میں زندگی یہ عنایت خدا کی ہے
آگے جو کچھ کہوں تو شکایت خدا کی ہے

قدر مرنے کی ہم سمجھتے ہیں
صدمے جھیلے ہیں زندگانی کے

ہیں جو ہر اک سے خطا اپنی بیان کرتا ہوں
ہے یہ مطلب کہ اسے کوئی ستمگر نہ کہے

رندی و مستی

وہ مست ہوں کہ ساغرِ مے جب میں پا گیا
اکبار یا غفور کہا اور چڑھا گیا

وہ چاٹ دوں کرے نہ مذمت شراب کی
واعظ کے منہ پہ مُہر لگا دوں کباب کی

بھاری بہت ہی لاؤ لگا روزِ حشر ہیں رند
رکھوا کے سر پہ شیخ کے گٹھری گناہ کی

قتل موذی کا تو شرعاً ہے درست
ناصح اتبک کیوں سلامت رہ گیا

ہماری رائے میں بہتر ہے میکشی کو صلاح
اب آگئے قاضی و مفتی و محتسب کی صلاح

شیخ جی مر گئے ہیں ان کے مرید
جس دم کا گمان کرتے ہیں

کرامات میں محتسب کو رہنے دو
مست بھی ہوشیار رہتے ہیں

تجھے کیا ہم جو وصفِ ساقیِ گلفام کرتے ہیں
تو اپنا کام کر واعظ ہم اپنا کام کرتے ہیں

خم کے خم صاف جو کر جاتے تھے وہ باقی نہیں
ذکرِ خیر آج تک ان کا ہے خراباتوں میں

تقویٰ کہاں کا جام چلے آج زاہدو
خرقے اتار اتار کے بھٹی میں جھونک دو

نہ واعظ ہجو مے کر ایکدن دنیا سے جانا ہے
ارے منہ ساقیِ کوثر کو بھی آخر دکھانا ہے

میکدے مے بیٹھے وعظ سنتے امیر
یہ بڑی تمنے ہوشیاری کی

مجکو زاہد نہیں حرام شراب
تیسرے دن میسر آئی ہے

تھی اپنی جانماز تو مدت سے رہن مے
تسبیح رہ گئی تھی سو وہ اب گرو ہوئی

قاضی آئے کہ محتسب آئے
ابتو ہم میکدے میں آ بیٹھے

مسجد میں بلاتا ہے ہمیں زاہد نافہم
ہوتا کچھ اگر ہوش تو میخانے نہ جاتے

مجلسِ وعظ میں آنا تو نہ ممکن تھا امیر
ہمکو تھامے ہوے یاں دستِ سبو لایا ہے

سمجھا نہ میں تو حضرتِ ناصح کی ایک بات
کچھ خود ہی وہ کہا کئے خود ہی سنا کئے

کوئی دم بے تکلف ہوکے مستو ہمیں اگر بیٹھے
تو جو کچھ عرش پر ہے دیکھلے زاہد وہ گھر بیٹھے

مجلسِ وعظ میں جب بیٹھتے ہیں ہم میکش
دخترِ رز کو بھی پہلو میں بٹھا لیتے ہیں

ملی ہے دخترِ رز لڑ جھگڑ کے قاضی سے
جہاد کرکے جو عورت ملے حرام نہیں

جو مست ہوش میں آنے کا قصد کرتا ہے
پکارتا ہے یہ ساقی کہ ہوشیار ہو نہیں

واعظ کو تم تو دیکھتے ہی ہنس پڑے امیر
باتیں تو ان بزرگ کی تمنے سنیں نہیں

ساقیا دخترِ رز کا تو بڑا رتبہ ہے
بے وضو میں کبھی چھوتا نہیں پیمانے کو

رندو جو ملو حضرتِ قاضی سے تو دب کے
سمجھو کہ بزرگوں میں ہیں یہ بنتِ عنب کے

تم بھی رویا مجھے پیمانہ بھی رو دیا مجھکو
جتنے تھے چھوٹے بڑے سب بھر کے ماتم میں رہے

جام مے کاتبِ اعمال کو بھی دے ساقی
دو بزرگ آئے ہیں ساتھ اگلے زمانے والے

ہجو مے ہو چکی منہ سے اب اتریں نیچے
رند کچھ حضرتِ واعظ سے ہیں کہنے والے

کہئے جو چاہئیے مسجد میں جنابِ واعظ
آپ سے ہم سے تو میخانے میں حضرت ہو گی

ہم وہ میکش تھے کہ پی جاتے تک شراب
دامنِ قاضی سے منہ پونچھا کیے

حضرتِ ناصح یہاں آئے تھے آج
دیر تک کچھ بیٹھے جھک مارا کیے

غدر سے مسلّم اور جو واعظ
ملے دستِ بتانِ نازنیں سے

قاضی و محتسبِ شہر سدھارے حج کو
میکشو خوب پیو حلق کے دربان گئے

زاہد و وعظ کی مجلس سے کسے ہے انکار
تم چلو پہلے میں آیا ابھی میخانے سے

لیگئے مسجد سے مجھکو مغ بچے
توبہ توبہ میں پکارا ہی کیا

ہے دخترِ رز حلال تجھے کیا تمیز ہے
واعظ یہ زرِ خرید ہماری کنیز ہے

زاہد امیدِ رحمتِ حق اور ہجوِ مے
پہلے شراب پی کے گنہگار بھی تو ہو

بیعتِ پیرِ مغاں طرفہ مزا دیتی ہے
سلسلہ ساقیِ کوثر سے ملا دیتی ہے

تشبیہات

سارا جہاں نام کے پیچھے تباہ ہے
انسان کیا عقیقِ یمن سے نکل گیا

ہے دل کا سرد مہریِ معشوق سے یہ حال
جیسے درخت برف سے کوئی جلا ہوا

اخگر کی طرح نیست بتدریج تن ہوا
تن پیرہن تو پیرہن اپنا کفن ہوا

نہیں ہے مُہر لفافے پہ خط کے اے قاصد
یہ داغ ہے مری قسمت کی نارسائی کا

ایک سے ہیں مرے حضر اور سفر کی صورت
گھر میں ہوں گھر سے نکل کر بھی نظر کی صورت

پیرِ مغاں کی بزم میں جنت ہے یہ کہاں
جنت میں جیسے شام نہیں ہے سوائے صبح

سمجھے ہم پہونچی جو ابرو تک پلک اُس آنکھ کی
باڑھ دیکھی رکھکے انگلی ترک نے تلوار پر

حسرتِ مژہ کو بھی ہے تاکِ چشمِ ساقی کی — گرے ہیں سیکڑوں میخوار ایک ساغر کو

رکھا یہ تم نے پائے حنائی رکاب میں — یا پھول بھر دیے طبقِ آفتاب میں

لٹک کر وہ زلف آئی ہے تا کمر — کہ لیلیٰ ہے مجنوں کی آغوش میں

سمجھا یہ ہیں جو نکلے شاخوں سے گل چمن میں — صوفی نکل کے بیٹھے خلوت سے انجمن میں

کبابِ سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں — جل اٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

صورتِ غنچہ کہاں تابِ تکلم مجھکو — منہ کے سو ٹکڑے ہوں آئے جو تبسم مجھکو

پلکیں دمِ جوشِ خوں فشانی — دھاریں نظر آتی ہیں لہو کی

چمکتی نہیں ابر سے برقِ تاباں — لٹکتا ہے پردے سے دامن کسی کا

بے ترے حالت ہے یہ گلزار کی — نکہتِ گل سانس ہے بیمار کی

شفقِ شام نہیں ہے یہ مرے ماتم میں — منہ کو آیا ہے کلیجا شبِ تنہائی کا

دل ہے تباہ قافلۂ اشک و آہ میں — گھیرا ہے آندھی پانی نے بیکس کو راہ میں

نہ دو رقیب کو تم داغ اپنی الفت کا — زمینِ شور سزاوارِ لالہ زار نہیں

جو نازک طبع ہیں محفوظ ہیں قہرِ الٰہی سے — کبھی چھالے حبابوں کے نہ پھوٹے خارِ ماہی سے

ہر چند کہ ہو صاف سخن لاف ہے بیجا — ہوتی ہے گرج جانے سے گوہر کی خرابی

سزا قاضی کی کیا چھڑوائیگی مستوں سے میخواری — قلم جب باغباں کرتا ہے انگور اور پھلتا ہے

بوتلوں سے رات دن ڈھلتی ہے مے — یہ نئی بدلی نئی برسات ہے

مسی پر چھوٹ افشاں کی پڑی ہے — کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے

نہیں پلکوں کی اوجھل ہیں وہ پتلی — دلھن چلمن میں شرمائی کھڑی ہے

گھٹا میں برق جو چمکی تو یاد آئی اکبر — ادا کسی کے وہ پردہ اٹھا کے آ نکلی

حقا کہ دو جہاں میں ہے ذاتِ الٰہ ایک — دو آنکھیں جس طرح کہ ہے انہیں نگاہ ایک

نہیں گھبرا ہے پلکوں نے یہ چشمِ مست دیکھو — لیا ہے دونوں ہاتھوں سے کسی میکش نے ساغر کو

وہ ہم نازک لبوں کو آنکھ دکھلاؤ تو کیا گزرے — دکانِ شیشہ گر میں مست آجائے تو کیا گزرے

جینا بھی دل جلوں کو تمہارے ممات ہے — اخگر کو موت قطرۂ آبِ حیات ہے

تصوف

خلوت میں تھا تو شاہدِ معنی تھا میں امیر — خلوت سے انجمن میں جو آیا سخن ہوا

شبیہ مدِ نظر ہے کسی کی کہ کوئی پوری نہیں اترتی — مٹادی صانعِ ازل نے ہزاروں نقشے بنا بنا کر

آوازِ کُن جو آئی کانوں میں ہم یہ سمجھے — غربت پکارتی ہے بس رہ چکے وطن میں

فنا کیسی بقا کیسی جب اُسکے آشنا ٹھہرے — کبھی اِس گھر میں آنکلے کبھی اُس گھر میں جا ٹھہرے

ایک قطرہ خون ہے دل پر وہ قطرہ ہے امیر — غوطے کھاتے پھرتے ہیں جس میں دو عالم آجتک

یہ تو ہیں کیونکر کہوں تیرے خریداروں میں ہوں — تو سراپا ناز ہے میں نازبرداروں میں ہوں

بیگناہوں میں چلا زاہد جو اسکو ڈھونڈنے — مغفرت بولی ادھر آ میں گنہگاروں میں ہوں

اِس شان سے ہم آئے تری جلوہ گاہ میں — مشعل دکھائی برقِ تجلی نے راہ میں

نگاہِ گرم سے مجھکو نہ دیکھ اے دوزخ — خبر نہیں تجھے کس کا گناہگار ہوں میں

ابتک کسی پہ میری حقیقت نہیں کھلی — حرفِ نگفتہ ہوں سخنِ ناشنیدہ ہوں

پردے سے اُسکی ذات کو کیا کام تھا امیر — چھپ کر صفاتِ نامتناہی میں لگی

لیں ساتھ مجھے ڈرتے ہیں کیوں حضرتِ موسیٰ — طالب ہیں وہ خود دیدۂ دیدار طلب کے

بیرنگ اُنکی شانِ تجلی نے دیکھئے — اتنے عیاں ہوئے کہ نظر سے نہاں ہوئے

فنا جو قبلِ فنا ہو بقا کی راہ ملے — یہ قلعہ وہ ہے جہاں موت سے پناہ ملے

او بندۂ بت دیکھ خدا اور ہی کچھ ہے — بت پردہ ہیں پردے میں چھپا اور ہی کچھ ہے
حق شناسی کی حقیقت کو نہیں نے جانا — اے امیر اپنی حقیقت کو جو پہچان گئے
تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے — سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

بے ثباتی و عبرت

پھولوں سے کہہ صبا یہ خوشی کی جگہ نہیں — رونے کا ہے مقام ہنسی کی جگہ نہیں
غنچے کہتے ہیں کہ کیا جلد گزرتی ہے بہار — مسکرا لینے کی فرصت بھی گلستاں میں نہیں
وہ گلعذار کہ تلتے تھے روز پھولوں میں — انھیں کی خاک شریک آج ہے بگولوں میں
جو ہی بہار اسکو خزاں کا خطر بھی ہے — اے باغباں بسنت کی تجھکو خبر بھی ہے
سر راہ عدم گور غریباں طرفہ بستی ہے — کہیں عبرت برستی ہے کہیں حسرت برستی ہے
لاش پر عبرت یہ کہتی ہے امیر — آئے تھے دنیا میں اس دن کیلئے

قطعہ

محفل برخاست ہے پتنگے — رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسمان پر — تارے کہیں نام کو رہے ہیں
ان کی بھی نمود ہے کوئی دم — وہ بھی نہ رہینگے جو رہے ہیں
دنیا کا یہ رنگ اور ہم کو — کچھ ہوش نہیں ہے سو رہے ہیں

شوخی

مری صورت جو بدلی فرط غم سے — تو وہ بولے کہ اچھا روپ بدلا
نوجواں لوگ کیا نہیں کرتے — دل لگایا تو کیا گناہ کیا
وصل کو ان سے جو کہئے تو کریں عذر حشر — کیجے قتل کی خواہش تو ابھی حاضر ہیں
میں خار ہوں اے برق جلاتی ہے مجھے کیا — گلچیں ہیں ہزاروں کسی گلچیں کو جلا دے

ہوں میں بیمارِ محبت کوئی مجرم تو نہیں
میرے گھر پر ہی طبیبوں کی چڑھائی کیسی

دشت میں گھبرا کے جا نکلے جو ہم
قیس بولا پیر و مرشد خیر ہے

مرا خط پھینک کر قاصد کے منہ پر طنز سے بولے
خلاصہ سارے اِس طومار کا یہ ہے کہ مرتے ہیں

کہتی ہے شبِ وصل یہ چتون کی شرارت
آج آگ لگا دونگی میں دامانِ حیا میں

پھر وہی میں ہوں وہی جامہ دری وحشت میں
پہلے واعظ سے ذرا دست و گریباں ہو لوں

روز آئینے کو جب کہا بولے
اک تمھیں مجکو پیار کرتے ہو

پوچھتے ہیں وہ مجھ سے عید کے دن
کہو کیا مل گیا گلے مل کے

قبر کھولی تو مگر یہ مری وحشت سے ڈرا
اپنی چادر بھی یہیں دزدِ کفن چھوڑ گیا

حکمت مقولہ مسلمہ

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

سودا و میر دونوں تھے کامل مگر امیر
ہے فرق واہ واہ میں اور آہ آہ میں

شاعر کو مست کرتی ہے تعریفِ شعر امیر
سو بوتلوں کا نشہ ہے اک واہ واہ میں

زمانے بھر میں پڑی ہے پکار حاتم کی
دیا ہے جس نے کہ حاتم کو اسکا نام نہیں

الفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو
ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

غفلت میں نہ کھو شباب اے دل
یہ رات ہے جانِ عمر بھر کی

جو کسی کو برا بھلا نہ کہے
وہ کسی سے برا بھلا نہ سنے

امیر ایسے ویسے تو مضموں ہیں لاکھوں
نئی بات کوئی کبھی سوجھتی ہے

ہے جوانی خود جوانی کا سنگار
سادگی گہنا ہے اس سن کے لئے

دنیا ہے طرفہ میکدہ بیخودی امیر
سب مست ہیں کسی کو کسی کی خبر نہیں

امتحانِ دوست دشمن ہے عبث — یہ تو اپنے دل سے پوچھا چاہیے

جاری ہے لین دین یہ رسمِ زمانہ ہے — دریا کا ابر - ابر کا دریا خزانہ ہے

حسن کھلتا ہے حسینوں کا جسے جلتی نگاہ — جس قدر دیکھو ابھرتا ہے بدن تصویر کا

طور و موسیٰ

بھیریں پڑ جائے تا آنکھ اس رخِ پرنور پر — چڑھ کے بیٹھے ہیں کلیم اللہ کوہِ طور پر

جو گھر میں پھر کے ہم ان کے حضور سے آئے — کلیم پھر ملاقاتِ طور سے آئے

ای برقِ حسنِ یار یہ اچھا ظہور تھا — دیدار کو کلیم تھے جلنے کو طور تھا

جمالِ یار کو کہتے ہو تم کہ ہاں دیکھا — کلیم ہوش میں آؤ ابھی کہاں دیکھا

موسیٰ کو یہ چڑھی ہے کہ برقِ جمال تھی — اک تہ اتر گئی تھی تمہاری نقاب کی

قطعہ

کیسی ارنی کہاں کے موسیٰ — خود دید کی اپنی آرزو کی

تھا پردہ ظاہری جو منظور — آواز بدل کے گفتگو کی

اب عشق میں کلیم کیوں ہو خاموش — پچھلے نہ سنبھل کے گفتگو کی

گرمیِ شوق یہ کہتی ہے چلو دیکھیں تو — سنتے ہیں طور پہ بھی ایک نہال اچھا ہے

نعتیہ

ہیں قائل آپ کے روضے کا ہوں قائلِ طور — کلیم سے نہ کسی دن کلام ہو جائے

کہاں ہیں جذبات کے دیکھنے والے کہاں ہیں تاثیر کے ڈھونڈنے والے کہاں ہیں صائب کی جدت تشبیہات پر لوٹنے والے کہاں ہیں خمخانۂ حافظ کے متوالے آئیں اور کلامِ امیر کو دیکھیں اور انصاف کریں کہ انہیں کیا نہیں ہے اور کس چیز کی کمی ہے۔ میرا خیال وثوق کے ساتھ ہے کہ جس مذاق کا جس رنگ کا جس پایہ کا شعر مطلوب ہو آپ کو امیر کے کلام میں ملجائے گا اور

ایک نہیں بہتیرے ملینگے ؂

کونسا گل ہے جو اِس گلزارِ معنی میں نہیں

کونسا موتی ہے جو دامانِ دریا میں نہیں

میں نے صرف امیر کے تغزل سے بحث کی ہے قصائد کی بلندی و سوخت کی گویائی جو سحر و اعجاز کا نقشہ دکھاتی ہے وہ تعریف سے بالاتر ہے حق یہ ہے کہ امیر کی زبردست شاعری۔ اُنکا علم و فضل۔ اُنکی درویشی۔ اُنکے اخلاق و اوصاف۔ اُنکا زہد و ورع آپ غور سے دیکھیں گے تو اِسکا اعتراف کرینگے کہ ہندوستان میں حضرت امیر کی ذات عدیم النظیر تھی۔ اور حیرت اِس بات پر ہوتی ہے کہ باوجودِ خدمت سلاطین و باوجودِ عبادات و ریاضات اُنہوں نے ملک کیلئے اتنا بڑا کام کیا کہ تیس سے زیادہ کتابیں تصنیف فرمائیں جنہیں ہر نسخہ نسخۂ اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ یہ وہ دولت ہے جو شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو ؂

خاص ملبوس اویسِ قرنی نے پایا

دین اللہ کی ہے اِسمیں اجارا کیا ہے (امیرؔ)

جنابِ جلیل کا مُلک پر احسان ہے کہ اُنہوں نے یہ کتاب لکھکر حجابات اٹھا دیے جس سے حضرت امیر کی ملا ایک فریب تصویر اور اُنکے فضائل و کمالات کا مرقع آنکھوں کے سامنے آگیا۔ جزاہُ اللہ خیر الجزا۔

مولانا حالی مرحوم نے مرزا غالب کی سوانح عمری (یادگارِ غالب) بہت اہتمام سے لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ سوانح نگاری میں مولانا کو ید طولےٰ حاصل تھا مگر اِسکو وہ کیا کرتے کہ انتخابِ کلام اردو غالب کے شایانِ شان فراہم نہ ہوسکا

لہٰذا مولانا نے حصۂ اول میں غالب کی اعلیٰ شخصیت کا جو وقار قائم کیا تھا وہ حصۂ ثانی میں سرمایۂ کلام کے ناکافی ہونے سے قائم نہیں رہ سکا۔ البتہ فارسی کا حصۂ کلام بہت شاندار ہے جو مصنّف کی پرگوئی اور استعداد کامل کو ثابت کرتا ہے۔ لیکن نظیری و ظہوری کے کلام سے جو موازنہ کیا گیا ہے اسمیں کہیں غالب کا غلبہ نہیں پایا جاتا۔

ناسخ کا رنگ شاعری اور اسکا عالمگیر اثر

سوانح عمری کے حصۂ دوم میں جناب جلیل تحریر کرتے ہیں ناسخ نے جسطرح زبان کی اصلاح کی تھی اسیطرح شاعری کی بھی جدید بنیاد ڈالی تھی۔ اُنھوں نے اور اُن کے ہمعصروں نے صائب و کلیم و سلیم کی گویائی اختیار کی تخیّل کو بہت بلندی پر پہونچا دیا جس سے شعر میں زور اور لنگر پیدا ہو گیا۔ اور بندشیں چست ہو گئیں (اور اس کے ثبوت میں مولف نے ناسخ اور اُنکے ہمعصروں کے جو اشعار پیش کئے ہیں وہ قابل دید ہیں) اس جدّت کا اثر لکھنؤ تک محدود نہیں رہا بلکہ عالمگیر ہو گیا۔ ہر قابل شاعر اسی جادہ پر گامزن ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ ملاحظہ ہو ناسخ اور ذوق کا ایک ایک مطلع

مرتبہ کم اوجِ رفعت سے ہمارا ہو گیا　　آفتاب اتنا ہوا اونچا کہ تارا ہو گیا　(ناسخ)

نام یوں پستی سے بالاتر ہمارا ہو گیا　　جسطرح پانی کنویں کی تہہ میں تارا ہو گیا　(ذوق)

اِس بیان کا منشا ناسخ کو اربابِ دہلی پر ترجیح دینا نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا ہے کہ ناسخ کا اگر کوئی پایہ نہ ہوتا تو اکابر شعرائے دہلی کلامِ ناسخ کے جواب دینے اور اُن کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کیوں کرتے۔ اِس مفاد کے مدِ نظر میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اساتذۂ دہلی کی چند غزلیں نقل کردوں جو ناسخ کے رنگ میں

کہی گئی ہیں۔

ذوق

ہوا حمدِ خدا میں دل جو مصروفِ رقم میرا
الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا

صراطِ عشق پر از بسکہ ہے ثابت قدم میرا
دمِ شمشیرِ قاتل پر بھی خوں چلتا ہے جم میرا

ہوا ہے سینہ یکسر خار زارِ دشتِ غم میرا
کہ آیا پائے خوں آغشتہ ہو کر لب پہ چشم میرا

وہ ہوں میں گیسوِ موجِ محیطِ اعظمِ وحشت
کہ ہے گھیرے ہوئے روئے دنیا کو پیچ و خم میرا

نشانِ بے رواجی گر دکھائے زورِ دستِ جاں
جھپک سی دیدۂ صراف کی نقشِ درم میرا

وہ ہوں میں رہ نوردِ شوق میرے ساتھ جاتا ہے
برنگِ سایۂ مرغِ ہوا نقشِ قدم میرا

نہ ہو کیوں قدر ترکِ سجدۂ ابلیس سے آدم
عدو کی سرکشی سے ذوق کیا ہوتا ہے کم میرا

شوقِ نظارہ ہے جب سے اس رخِ پرنور کا
ہے مرا مرغِ نظر پروانہ شمعِ طور کا

اے صنم گر پوچھتا ہے حال اس رنجور کا
دل نہ اٹکائے کہیں اللہ ہے مقدور کا

وادیِ ظلمت میں اپنی دخل کب ہے نور کا
پھر اک شعلہ سا ہے سو بھی چراغِ طور کا

تیرے کوچے میں ہے تن لاغر ترے رنجور کا
اک غبارِ ناتواں ہے کارواں رنجور کا

بادۂ مضموں جو اپنی شورِ بختی کا کری
ہو زمیں شعر میں عالم زمینِ شور کا

لذتِ دل وہ ہوں کہ میرے داغِ سوزاں کے لیے
گرمیِ مرہم سے اڑ جائے اثر کافور کا

دفن ہے جس جا پہ کشتہ سرد مہری کا تری
بیشتر ہوتا ہے پیدا واں شجر کافور کا

عشق نے ڈالی تھی جب قصرِ محبت کی بنا
لکھ دیا تھا کوہکن بھی نام اک مزدور کا

دل ہے وحشت اتنا کہ بھی شاخِ آہو کا
پیچ کھاتا ہے دھواں میرے چراغِ گور کا

دیکھنا زہرابِ پیکانِ محبت کا اثر — چشم افعی بن گیا روزن ہر اک ناسور کا
ذوقِ راہِ عشق وہ کوچہ ہے جس کی خاک میں — ہے دُرِ تاجِ سلیماں بیضہ بیضہ مور کا

مومن

نہ کیونکر مطلعِ دیوان ہو مطلع مہرِ وحدت کا — کہ ہاتھ آیا ہے روشن مصرع انگشتِ شہادت کا
بچاؤں آبلہ پائی کو کیونکر خارِ ماہی سے — کہ بامِ عرش سے پھسلا ہے یارب پاؤں [illegible] کا
سرشکِ اعترافِ عجز نے الماس ریزی کی — جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتۂ طاقت کا
نہ یہ دستِ جنوں ہی اور نہ یہ جیبِ جنوں کو شایاں — کہ ہو دستِ قفرہ سی چاک پردہ چشمِ حیرت کا
ندے تیغِ زباں کیونکر شکستِ رنگ کو طعنے — کہ صفہای خرد پر حملہ ہے فوجِ خجالت کا
نہ پوچھو گرمیِ شوقِ ثنا کی آتش افروزی — بنا جاتا ہے دستِ عجز شعلہ شمعِ فکرت کا
نمک تھا بختِ شورِ فکر خوانِ مدحِ شیریں کا — زہے دندانِ طمع نے خون کیا ہے دستِ حسرت کا
عنایت کر مجھے آشوب گاہِ حشرِ غم اک دل — کہ جس کا ہر نفس ہم نغمہ ہو شورِ قیامت کا
جراحت زار اک جاں دے کہ جس کی ہر جراحت سے — نمکداں شورِ الفت سے مزا آوے عیادت کا
زمانہ مہدیِ موعود کا پایا اگر مومن — تو سب سے پہلے تو کہیو سلام پاک حضرت کا

لے اڑی لاشہ ہوا لاغر زبس تن ہو گیا — ذرۂ ریگِ بیاباں اپنا مدفن ہو گیا
بن ترے ای شعلہ رو آتشکدہ تن ہو گیا — شمع قد پہ میرے پروانہ برہمن ہو گیا
تھی کہیں غارتِ بوسِ دہن ہنگامِ خواب — شب کی بیداری سحر کا خواب رہزن ہو گیا
ایک ہی جنبش میں تھی صد راحتِ خوابِ عدم — طفلہای اشک کو گہوارہ دامن ہو گیا
میرے جلنے پر جو رویا غیر تیری بزم میں — سوزِ دل کو آبِ اشک آتش پہ روغن ہو گیا

پاؤں زنداں سے اٹھو کیا سر اٹھا سکتے نہیں
حلقۂ زنجیر آخر طوق گردن ہو گیا

شہر میں ہر شہرہ کس قد قیامت زا کا کیوں
جلوہ گاہ حشر ہر کوی برزن ہو گیا

ہم یقینی جوش وحشت سے فلک پر پہونچتے
خار دامنگیر عیسیٰ کی سوزن ہو گیا

آخر اشکوں کے بھر آنے نے ڈبویا ہے مجھے
چشم کا سوراخ تو کشتی کا روزن ہو گیا

خاک اڑائی میں نے کیا طرز جنون قیس کی
شاہجہاں آباد سارا نجد کا بن ہو گیا

داغ سینہ سے دل و جان و جگر سب پھک گئے
تھا چراغ خانہ ہمکو برق خرمن ہو گیا

اپنے مذہب کی کیا پڑھی اک اور ہو من نے شعر لیا
دو ہی دن میں یہ تو کیسا ماہر فن ہو گیا

مرزا غالب

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بیداد کاوش ہائے مژگاں کا
کہ ہر یک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا

ہنوز اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے
دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا ——— کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوکاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ ——— صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے ——— سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھائے ——— مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا ——— موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

غالب کا یہ مقطع بھی قابلِ لحاظ ہے جس میں ناسخ کے مصرع پر مصرع لگا کر ان کے
پایۂ اعتبار کا اعتراف کیا ہے ؎
غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ ——— آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں
غالب نے اس ایک شعر پر اکتفا نہیں کی بلکہ عودِ ہندی اور پنج آہنگ میں
جو کچھ لکھا ہے وہ بھی قابل ملاحظہ ہے۔ عود ہندی صفحہ ۱۲۰ میں لکھتے ہیں۔
شیخ امام بخش طرزِ جدید کے موجد اور پرانی
ناہموار روشوں کے ناسخ تھے۔
پنج آہنگ میں غالب کے کئی خط ناسخ کے نام ہیں ایک خط میں اپنے
کلام کا ذکر لکھا ہے جو تحفتہً ناسخ کو بھیجا ہے اور آرزو کی ہے کہ انکی نظر
پڑ جائے۔ عبارت یہ ہے ملاحظہ ہو صفحہ (۷۲)
این ورقہائے بخونِ جگر نگاربستہ ارمغانیست از غالب
جگر خستہ بحضرتِ خدام والا مقام سخن سنج معنی پناہان
اسپارگاہِ نظامی نظام و ظہوری ظہور نظیری نظیر فیضی فیض ضمیری ضمیر

شانی شان نوائی نوار فغانی فغاں در علم صائب و در عمل
راسخ مخدوم معظم و مطاعِ مکرم مولانا ناسخ کہ در سخن طرح نوی ریختہ
اوست و در ریختہ نقشِ بدیع انگیختۂ او فرستادنِ ایں فہرست
نادانی بداں دانا آموزگارنہ ازاں روست کہ طبع آہنگِ نمائش
دہست بعرضِ تجمل گرایش دارد بلکہ نامہ نگار دریں پردہ سگالی است
کنیز بخت ایں تیرہ سرانجامانِ قلمرو تحریر طبعاں نگاہِ قبولِ مولانا روشنی
اندوزد و انچہ بہ گزلکِ انصاف قابل ازیں اوراق نستردہ
رسیدہ است بغازۂ تحسینِ مخدوم رخ امتیاز افروزد۔“
صفحہ ۱۱۳ میں لکھتے ہیں۔
سبحان اللہ سخن بروزگارِ مخدوم بپایۂ بلند رسید و ارد و را
رونقِ دیگر پدید آمد۔ اینکہ تا رسیدنِ نامۂ من بخاطرِ عاطر جاے
گرفت و شکوہ آن بزبانِ قلم رفت مرا آبرو افزود و ارزشِ مرا
در نظرم جلوہ گر ساخت خوشا من کہ در آن چشم و دلم جاے باشد الخ

شعرائے لکھنو کی قادر الکلامی۔ شکاری پرند جب بڑے بڑے شکار مارنے کا خوگر ہو جاتا ہے تو چھوٹے جانوروں کا شکار اسکے نزدیک کوئی بات نہیں ہوتی اِسطرح شاعر کے شہبازِ فکر کو جب عنقائے بلند پروازِ معانی کے صید پر قدرت ہو جاتی ہے تو اُن کے ساتھ معمولی مضامین جو عصافیر کا درجہ رکھتے ہیں خود بخود آکر اسیرِ دام ہو جاتے ہیں تلاش کی حاجت نہیں ہوتی بقولِ حضرت امیر ؎

کیوں وہ صیاد کسی صید پہ توسن ڈالے ۔۔۔ خود بخود صید چلے آتے ہیں گردن ڈالے

تشبیہات میں ذکرِ صائب کی فلک پیمائی سب پر ظاہر ہے ان کے بلند و پُر زور مضامین پہاڑوں کی چوٹیوں سے رفیع تر ہیں جیسے یہ اشعار ؎

دامن کشیدن از کفِ عشاق سہل نیست
یوسف ازیں گناہ بزنداں نشستہ است

صائب ز طلا یک مطلب رتبۂ انساں — آئینۂ بے پشت چہ دیدار نماید
صائبا خجلتِ سائل بزر و سیم مخر — بے زری کرد مرا آنچہ بہ بازارِ دل زر کرد
دستِ سوال پیشِ کساں کردہ دراز — پل بستہ کہ بگذری از آبروے خویش
سینہ ہا را خامشی گنجینۂ گوہر کند — یاد دارم از صدف ایں نکتۂ سربستہ را
دہد ثمر ز رگ و ریشۂ درخت خبر — نہفتہ ہاے پدر از پسر شود پیدا
حریص را نکند نعمتِ دو عالم سیر — ہمیشہ آتشِ سوزندہ اشتہا دارد

مگر باوجود اسکے غزل کا رنگ بھی جسکو تغزل کہنا چاہیے ان کے یہاں بکثرت ہے

ہر دم آزردگیِ غیر سبب را چہ علاج — با گرسنیم ز لطفت تو غضب را چہ علاج
فرض کردم کہ بیادِ تو دلم خرسند است — لیکن ایں دیدۂ دیدار طلب را چہ علاج
می تواں کرد نہاں عشق ز ہمدم لیکن — زردیِ رنگِ رخ و خشکیِ لب را چہ علاج
زباں ز گفتۂ بیجا بجاں رساند مرا — لبِ خموش بدارالاماں رساند مرا
ز بیکسی چہ شکایت کنم بہ پیشِ کسے — کہ بیکسی بہ کسِ بیکساں رساند مرا

یہی حال شعرائے لکھنؤ کا تھا کہ وہ خالی خیال ہی سے تھے اور تغزل بھی بلکہ ناسخ کو اردو کا صائب کہتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان میں قوتِ معنی آفرینی پیدا کرنی ہے وہ لوگ کسی رنگ میں بند نہ تھے ریختی کہی تو انشا اور رنگین کو طاقِ نسیاں پر

جڑھا دیا۔ واسوخت کیطرف توجہ کی تو صدہا باغ لگا دیئے۔ مرثیہ گوئی پہ آئے تو دریا بہا دیا۔ یہ سب اسی قوتِ فکریہ کا نتیجہ تھا جو اُس دور نے ہر طبیعت میں پیدا کر دی تھی۔ ایک وقت میں رعایتِ لفظی کا بھی وہاں چرچا ہو گیا تھا چنانچہ امانت نے اسی رعایت کیساتھ تین سو سات بند کا واسوخت کہا جسکی مقبولیت کے نقوش دلوں سے آجتک محو نہیں ہوئے۔ نواب فردوس مکاں کے ایک واسوخت میں بہار کا مضمون تھا انکی اصلاح میں حضرت امیر نے وہ وہ گل کھلائے کہ پورا واسوخت تختۂ گل بن گیا جو لفظ ہے سدا بہار پھول ہے جو حرف ہے گلاب کی پنکھڑی ہے۔ مرزا دبیر سے لوگوں نے غیر منقوط مرثیہ کہنے کی فرمائش کی انہوں نے پورا مرثیہ غیر منقوط کہکر فکرِ عالی کا اعجاز دکھا دیا اس مرثیے میں تخلص عطارد موزوں کیا ہے۔

معتبر ذریعے سے یہ حکایت مجھ تک پہونچی ہے کہ مرزا غالب کو اُن کے احباب نے مرثیہ کہنے پر مجبور کیا وہ ایک بند اور کچھ مصرع کہے تھے کہ اس اثنا میں ایک شخص نے آکر مرزا دبیر کا یہ مصرع پڑھ دیا۔

آ ہو کعبۂ قربانیِ داور ہے حسینؑ

اسپر مرزا غالب لوٹ گئے جو کچھ لکھا تھا پھاڑ کے پھینک دیا اور فرمایا کہ یہ انہیں لوگوں کا حصہ ہے۔

شعرائے لکھنو کے وہ اشعار جو مقبول ہو کر زبان زدِ خاص و عام ہو گئے ہیں اُن میں سے چند شعر میں اس جگہ لکھدوں تو لطف سے خالی نہ ہوگا۔

مصحفی

تھمتے تھمتے تھمینگے آنسو ۔۔۔ رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

شاہد رہیو تو اے شبِ ہجر
جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی

حسرت پہ اُس مسافرِ بیکس کی روئیے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

اے مصحفی میں رُوؤں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

دعوی کیا تھا گل نے اُس گل سے رنگ و بو کا
دھولیں صبا نے ماریں شبنم نے منہ پہ تھوکا

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

پھر بہار آئی چمن میں زخمِ دل آلے ہوئے
پھر مرے داغِ جگر آتش کے پرکالے ہوئے

یہ اُسکے ہیں ساعدوں کا عالم کہ جسنے دیکھا ہوا وہ بیدم
نیامِ تیغِ قضائے مبرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا

مسی مالیدہ لب پر رنگِ پاں ہے
تماشا ہے تہِ آتش دھواں ہے

شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں
لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
زمیں جسکی چہارم آسماں ہے

خدا سر دے تو سودا دے تری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

دل کو نالوں کی دمِ نزع ہوس باقی ہے
منزل آخر ہوئی فریادِ جرس باقی ہے

روح کے ساتھ ہی قالب میں تمنا بھی آئی
شمع آئی مرے گھر میں تو ہوا بھی آئی

خدا جانے یہ کسکی جلوہ گاہِ ناز ہے دنیا
ہزاروں اُٹھ گئے پھر بھی وہی رونق ہے محفل کی

آ کے سجادہ نشین قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی مری جا میرے بعد

تیز رکھنا سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسفِ بے کارواں ہو کر

نہ کیا نہ بچ گیا چھوڑ کے بسمل قاتل
دہنِ زخم پکارا کیا قاتل قاتل

تم کبھی نظر و سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

آنکھیں کھلی ہوئی ہیں عجب خواب ناز ہے
فتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے

لگا نہ رہنے دے جھگڑے کو یار تو باقی
رکے نہ ہاتھ ابھی ہے رگِ گلو باقی

آنکھیں نہ جیتے دینگی تری بیوفا مجھے
ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے

خدا پناہ میں رکھے تمہاری مژگاں سے
ستم کی فوج کھڑی ہے پرا جمائے ہوئے

کہا کسی نے نہ اتنا ہمارے دفن کے وقت
کہ ان پہ خاک نہ ڈالو یہ ہیں ہمارے ہوئے

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے
خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

سانس دیکھی تنِ بسمل میں جو آتے جاتے
اور چرکا دیا جلاد نے جاتے جاتے

دکھایا کنجِ قفس مجھکو آب و دانے نے
وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیاد

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

بہارِ عیش ہوتی ہے خزاں پیری کے آنے کو
جوانی روٹھی جاتی ہے کہیں کس سے منانے کو

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا
بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

اگر بخشے زہے قسمت نہ بخشے تو شکایت کیا
سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے
جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

دونوں کی رہی نہ جان تن میں
کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

کچھ جوانی ہے ابھی کچھ ہے لڑکپن اُن کا
دو دنا بازوں کے کھنچنے میں ہے جوبن اُن کا

قیامت ہے یارِ روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر — جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا (امیرؔ)
کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں — جل اٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں ״
گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں — مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں ״
تیر پر تیر لگاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے — سینہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے ״
ناوکِ ناز سے مشکل ہے بچانا دل کا — درد اٹھ اٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانا دل کا ״
ہے جوانی خود جوانی کا سنگار — سادگی گہنا ہے اس سن کے لئے ״
جوبن ابھار پر ہے چمن کو نہ جائیے — بادِ صبا لگائے گی چوری انار کی ״
اے برقِ حسنِ یار یہ اچھا ظہور تھا — دیدار کو کلیم تھے جلنے کو طور تھا ״
وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب — مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بیقرار ہوتا ״
فنا کیسی بقا کیسی جب اسکے آشنا ٹھہرے — کبھی اس گھر میں آ نکلے کبھی اس گھر میں جا ٹھہرے ״

ذیل کے اشعار بھی زبان زدِ خاص و عام ہیں لیکن مصنفین کے نام یاد نہیں رہے

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں — کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں
تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس — یہ وہ جامہ ہے کہ جسکا نہیں سیدھا الٹا
محبت ہو کسی سے یا عداوت — مزا دیجائے گی جو دل سے ہوگی
غمِ صیاد و خوفِ باغباں ہے — دو ٹکلے میں ہمارا آشیاں ہے

دربارِ رامپور۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ امیر کے دیوانِ دوم کا جو رنگ ہے وہ پہلے دیوان کا نہیں ہے۔ اور اسکی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ دربارِ رامپور میں اجتماعِ شعرا ہونے سے اہلِ دہلی کا اثر لکھنؤ والوں پر پڑا اور حضرت امیر نے داغ کا رنگ اختیار کیا۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ واقعہ اسکے برعکس ہے اور وہ یہ ہے کہ

دربار رامپور میں بعہدِ نواب خلد آشیاں لکھنؤ کے شعرا کبثرت تھے اسیر۔ امیر
جلال۔ بحر۔ قلق۔ منیر۔ ذکی۔ عروج۔ تسلیم۔ شرف۔ جان صاحب وغیرہ اور
دہلی کے صرف فصیح الملک داغ تھے۔ اور ایک صاحبعالم مرزا رحیم الدین حیا تھے
جنکی کوئی نمود نہ تھی۔ فطرت کا مقتضیٰ ہے کہ انسان جس سوسائٹی میں رہتا ہے
اُسی رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ نسیم دہلوی کا رنگِ شاعری اسکا شاہد ہے جو
لکھنؤ میں جاکر رہے تھے۔ اسیطرح رامپور کی زبردست سوسائٹی کا اثر داغ پر ہونا
لازم تھا اور ہوکر رہا۔ خصوصاً حضرت امیر کی صحبت سے جناب داغ نے معتدبہ
فائدہ اٹھایا۔ زبان کی صفائی کلام کی چستی اُسی کا نتیجہ ہے۔ دہلی کی شاعری
قابل تعریف مسلّم مگر اُسمیں صفائی نہیں ہے مضامین اندھیری رات میں جگنو کیطرح
چمک جاتے ہیں بخلاف اسکے لکھنؤ کی شاعری ایسی ہے جہاں روشنی ہی روشنی ہے
جسمیں شاہدِ معنی کے خط وخال صاف نظر آتے ہیں۔ داغ نے جو اس صاف اور
روشن شاعری کو دیکھا تو اُس تاریکی سے نکل آئے اور صاف شعر کہنے لگے۔

تلامذۂ ذوق کے کلام اور خود ذوق اور مومن اور غالب وغیرہ شعرائے
دہلی کے دواوین میں ذیل کے الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔

چلون (چلمن) بنھانا (بناہنا) نیہوری نظر (نیچی نظر) پیار بروزن بہار
آوے جاوے۔ کیجیو لیجیو۔ کشتۂ عاشق۔ آن پڑی۔ بیداد سوا (بیداد کے سوا)
طہور (مئے طہور) وے (مگر) کیونکہ (کیونکر) جائے ہے۔ آئے ہے۔ لائے ہے۔
کہے ہے وغیرہ لیک (لیکن) کہوے (کہے) دیکھہ (دیکھکر) مت (نہ) ٹک
اس رنگ (اس طرح) نے (نہ) پیاس بروزن ہراس کسو کے (کسی کے)

چاہیے ہے (چاہیے) قلم ہونٹ (خامہ)۔ شرابی والے (شرابی)
پس چلمن۔ حسرت و ارمان۔ فخر جہاں۔ اَٹ کھٹ۔ (ناز نخرہ)
داغ کا کلام اِن الفاظ (باعلانِ نون) اور ترکیبوں (باعلانِ نون) سے بالکل پاک ہے۔

ظہیر دہلوی تلمیذ ذوق جب حیدرآباد آئے اور حضرت داغ سے ملے ہیں اُس وقت موجود تھا جناب ظہیر نے اپنی ایک تازہ غزل سنائی سننے کے بعد حضرت داغ نے ظہیر سے فرمایا کہ تم نے غزل بڑی فکر سے کہی ہے اور معلوم ہوتا ہے بہت زور لگایا ہے مگر قسم لو جو میں ایک شعر بھی سمجھا ہوں۔ اِس سے ناظرین اندازہ کر لیں کہ ظہیر دہلوی کی شاعری سے جو دلّی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی داغ کو کسقدر بیگانگی تھی۔

حضرت امیر کی شہرت و مقبولیت اُن کے دیوان اول ہی سے ہو چکی تھی اُسی شاعری کی بدولت رامپور طلب کیے گئے اور اُسی کی بدولت نواب فردوس مکان نے اپنے کلام میں اصلاح لی۔ اور اُسی کی بدولت نواب خلد آشیاں نے اپنی استادی کیلئے تمام شعرائے دہلی و لکھنؤ میں امیر کو انتخاب فرمایا اس کے بعد کون سی ضرورت مجبور کر سکتی تھی کہ امیر اپنا طرز سخن چھوڑ کر داغ کا رنگ اختیار کرتے۔

نواب خلد آشیاں لکھنؤ کی زبان اور شاعری کے صرف دلدادہ ہی نہ تھے بلکہ اسمیں اُن کو انتہا کا غلو تھا۔ سوا شعرائے لکھنؤ کے کسی کو شاعر نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کے دربار میں دلی کی شاعری کا ذکر جرم سمجھا جاتا تھا۔

مرزا داغ کو زمرۂ شعرا میں نہیں رکھا بلکہ ریاست کے بعض کارخانوں پر مامور فرمایا تھا۔ انتہا یہ ہے کہ نواب صاحب نے حضرت امیر ایسے بے نفس اور صلح مشرب کو یہ شعر کہنے پر مجبور کیا۔

دعوے زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہارِ بوئے مشک غزالوں کے سامنے

اب رہی یہ بات کہ حضرت امیر کے اول و دوم دیوان میں فرق کیوں نظر آتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ دیوانِ دوم محض ایک رنگ میں ہے اور دیوان اوّل میں بمقتضائے دورِ ناسخ اور رنگ کے اشعار بھی ہیں۔ اگر وہ اشعار دیوانِ اوّل سے نکال دیے جائیں تو اول و آخر کے دیوان میں کوئی فرق نظر نہ آئیگا۔ جناب جلیل نے اسکے متعلق تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور دیوانِ اول کے بکثرت اشعار نقل کرکے ثابت کردیا ہے کہ دیوان دوم کا یہی رنگ ہے دونوں ایک ترکش کے تیر ہیں۔ اس تفصیل کو حصہ دوم سوانح عمری کے صفحہ ۴۸ تا ۸۷ میں ملاحظہ فرمائیے۔

اختر مینائی
معتمد و ناظم امور مذہبی کلکتہ مالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

لکھنؤ جب لکھنؤ تھا تو اسکی آبادی بہت گنجان اور طول وعرض چودہ پندرہ کوس تھا۔ شرفا کی آبادی بہت زیادہ تھی ہر قوم اور ہر طبقے کے شریفوں کا مامن ومسکن اور گلشن بے خزاں کہا جاتا تھا۔ نواب آصف الدولہ فردوس منزل کے امام باڑے کے سامنے جس میدان میں اس وقت حضرت قطب الاقطاب مخدوم شیخ محمد شاہ مینا[1] رحمۃ اللہ علیہ کا مزار پر انوار ہے یہاں ایک محلہ مینا بازار نام آباد تھا اسی محلے میں جناب[2] مولوی شیخ کریم محمد مینائی ایک عالم باعمل زہد وورع میں مشہور بزرگ رہتے تھے جن کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔

---

[1] مینا تعظیم ومحبت کا ایک لفظ ہے جو اس زمانے میں استعمال کیا جاتا تھا جیسا کہ اس زمانہ میں میاں کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

مخدوم شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ طریقت چار واسطوں سے حضرت نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ تک پہونچتا ہے اس طور سے کہ مخدوم شاہ مینا مرید ہیں حضرت شیخ سارنگ رح کے اور وہ مرید ہیں حضرت شیخ قوام الدین لکھنوی رح کے اور وہ مرید ہیں مخدوم جہانیاں جہاں گشت رح کے اور وہ مرید ہیں حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی رح کے اور وہ مرید ہیں حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیا

مولوی شیخ کرم محمد مینائی کے چھوٹے صاحبزادے حضرت منشی امیر احمد امیر مینائی ہیں۔ جنکی مختصر سوانح عمری اسوقت میں لکھ رہا ہوں۔

امیر کے مورثِ اعلیٰ شیخ عثمان عرب سے ہندوستان آئے اور دارالخلافہ دہلی میں رہے وہاں سے جونپور اور قصبۂ دلمؤ میں قیام کرتے ہوئے لکھنؤ آئے اور اقامت پذیر ہوئے انہوں نے اپنے فرزند شیخ قطب کو یادگار چھوڑا جنکی پشت سے ایک آفتابِ ولایت طالع ہوا جس کے انوار سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں یعنے شیخ محمد عرف مخدوم شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ

سلسلۂ نسب کی ترتیب یہ ہے، امیر احمد ابن شیخ کرم محمد ابن شیخ محمد معظم ابن شیخ محمد عظیم ابن شیخ خواجہ احمد ابن شیخ صالح ابن شیخ خواجہ ابن شیخ مبارک ابن شیخ حسین ابن شیخ گدائی ابن شیخ نظام ابن شیخ الہداد ابن شیخ ابراہیم ابن شیخ قطب الدین جانشین و برادرزادہ مخدوم شاہ مینا رحمۃ اللہ علیہ ابن شیخ ضمیرالدین ابن شیخ قطب ابن شیخ عثمان۔

مولوی شیخ کرم محمد اپنے خاندان کی قابلِ فخر یادگار اور جانشین تھے۔ یہ خاندان علم و فضل اور درویشی کی حیثیت سے معزز و محترم تھا۔ علاوہ عوام الناس کے شاہی خاندان میں بھی وہ موقر تھا۔ اطمینان اور آزادی کے ساتھ علوم و فنون۔ مجاہدہ اور مشاہدہ میں مصروف تھے۔ مولوی شیخ کرم محمد نے تین بیٹے اور تین بیٹیاں چھوڑکر انتقال فرمایا اور لکھنؤ ہی میں دفن ہوئے۔ امیر مرحوم اپنی ایک بہن سے بڑے باقی سب بھائی بہنوں سے چھوٹے تھے۔

بھائیوں میں سب سے بڑے مفتی طالب حسن مرحوم تھے پہلے یہ عدالت دیوانی لکھنؤ میں ملازم رہے پھر دیہی کی نظامتوں میں میر منشی ہوئے۔ جب غدر کا طوفان اٹھا تو یہ رامپور چلے آئے اور انیس برس عدالت دیوانی کے اعلیٰ حاکم رہے، چہتر سال کی عمر میں بمقام میرٹھ رحلت کی اور وہیں دفن ہوئے۔ بہت ہی کریم النفس اور عمدہ صفات کے بزرگ اور منشی

بے بدل تھے۔

شیخ عنایت حسین منجھلے بھائی کا نام تھا۔ یہ جید عالم تھے تمام عمر درس تدریس میں بسر کردی ان کا حافظہ اسقدر قوی تھا کہ قرآن مجید ایک مہینے میں حفظ کرکے سنا دیا تھا۔ لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تعلیم و تربیت

حضرت امیر کی ولادت ۱۶ شعبان روز دوشنبہ ۱۲۴۴ھ میں بعہد دولت نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئی۔ بہت ہی کم عمری میں ابتدائی تعلیم شروع کی گئی اور جیسا کہ دستور ہے ایک مولوی صاحب نے ابتدائی تعلیم کا آغاز کرایا، عام لڑکوں کے خلاف مستعدی اور تعلیمی شوق و ذوق ایک طرف تو قدرت نے عطا کیا ہی تھا دوسری طرف اُس موثر تربیت کا نتیجہ تھا جو مولوی شیخ کرم محمد اپنے ہونہار فرزند کو دے رہے تھے۔

اُس زمانے میں عربی علوم و فنون کی تکمیل ضروری سمجھی جاتی تھی خصوصاً اس نامور اور اہلِ علم کے خاندان میں تو عربی کی تعلیم لازمی تھی جس کے اکثر افراد عربی علوم و فنون کے ماہر تھے گیارہویں برس امیر مرحوم نے عربی زبان کی ابتدائی کتابیں اپنے منجھلے بھائی مولوی حافظ عنایت حسین سے شروع کیں جو اپنی آبائی مسند پر متمکن ہو چکے تھے۔ اور فیضِ تعلیم اُن سے جاری تھا۔

امیر مرحوم کی عمر ابھی نو برس چھ مہینے کی تھی کہ اُن کو یتیمی کا داغ نصیب ہوا یعنی اُن کے والد شیخ کرم محمد نے دنیائے ناپائدار سے رحلت کی۔ یہ ایسا سخت حادثہ تھا جس سے غالباً امیر مرحوم کی آیندہ تعلیم و تربیت پر خراب اثر پڑتا مگر خوش نصیبی سے اُن کے بڑے

بھائی مفتی طالب حسن مرحوم جو اُس وقت میر منشی نظامت اور برسرِ عروج تھے، چھوٹے بھائی کی پرورش اور تربیت میں شفیق باپ کی طرح مصروف رہے چنانچہ امیر مرحوم خود ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"بڑے بھائی کے تادمِ حیات مجھے کبھی اس کا موقع نہیں ملا کہ میں اپنے والد ماجد کا سایۂ شفقت سر سے اُٹھ جانے کا اثر محسوس کرتا"

الغرض مفتی طالب حسن مرحوم کے حسنِ توجہ سے امیر کا سلسلۂ تعلیم ٹوٹنے نہ پایا بلکہ انہوں نے بیش از بیش اُن کی تربیت و تعلیم پر توجہ کی۔ عربی صرف و نحو کی تکمیل امیر نے اپنے منجھلے بھائی سے کی اسکے بعد دیگر اساتذہ سے مختلف علومِ عربیہ کی تکمیل کا قصد کیا۔

فرنگی محل میں علم و فضل کے چشمے اُبل رہے تھے۔ حضرت امیر کو بھی اس آبِ حیات سے سیراب ہونے کا موقع ملا۔ مفتی محمد یوسف صاحب اور مولانا عبدالحکیم صاحب سے آپ نے منقولات کی تحصیل کی اور معقولات مفتی سعد اللہ صاحب سے پڑھے۔ اور مولوی تراب علی صاحب لکھنوی سے ادب کی تکمیل کی۔ یہ بات اُس وقت خواصِ شہر میں مشہور ہو گئی تھی کہ ادب کی طرف مولوی امیر احمد مینائی کا رجحان زیادہ ہے اور یہ معانی و بیان کی کتابیں نہایت صفائی سے طلبہ کو پڑھاتے ہیں۔ جامع العلوم ہو کر اور سندِ فضیلت حاصل کرنے کے بعد آپ نے علمِ طب کی طرف توجہ کی اور نواب حکیم محمد حسن خاں بریلوی سے اس فن کو بھی حاصل کیا۔ نواب صاحب حکیم مرزا محمد علی صاحب کے شاگردِ رشید تھے اور اُس وقت مرزا محمد علی سے زیادہ نامور طبیب کوئی دوسرا نہ تھا اُن کے قصے زبانوں پر آجتک ہیں۔ گو علم جفر امیر نے کسی سے پڑھا نہیں مگر مطالعہ کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ علمِ جفر کے ماہر ہو گئے تھے۔ اِس علم میں آپ نے دو کتابیں بھی تصنیف کی تھیں۔ رمز الغیب

اور رموزِ غیبیہ۔ ان دونوں کا نام ہے غرضکہ جملہ علوم پر آپ کی نظر عالمانہ و فاضلانہ تھی انیس ۱۹ بیس ۲۰ برس کی عمر میں آپ فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔

سلوک و درویشی

فقر اور درویشی آپ کی گھٹی میں پڑی تھی کیونکہ وہ خاندان ہی درویشوں کا تھا۔ زہد و تقوے کے دامن میں انھوں نے پرورش پائی۔ ریاضت و عبادت کے آغوش میں تربیت ہوئی ہوش سنبھالا آنکھ کھول کر دیکھا تو گھر میں سب کو اسی رنگِ درویشی میں ڈوبا ہوا پایا۔ امیر مرحوم نے مزار حضرت شاہ مینا رحؒ سے فیضِ باطن حاصل کرنا شروع کیا بیشتر اوقات مزار پر بیٹھے مراقب رہا کرتے تھے اور ذکر و اشغال طریقۂ آبائی میں مشغول رہ کر بطور خود ریاضت کرتے تھے۔ مخدوم شاہ مینا رحؒ کی روح پر فتوح تعلیم باطنی کی طرف متوجہ تھی اور اسی جانب سے بعنایت الٰہی امیر کی تربیت ہوتی رہی۔

ہنوز کسی شیخ سے بیعت ظاہری کی نوبت نہ آئی تھی کہ ایک دن مراقبے میں معلوم ہوا کہ حضرت شاہ مینا رحؒ نے ایک درویش کی صورت ان کو دکھا کر ارشاد فرمایا کہ تم ان کے ہاتھ پر بیعت کر لو بعد ازاں خواب میں بھی اس واقعہ کو کئی بار دیکھا اور منتظر رہے کہ وہ درویش جن کی صورت دکھائی گئی ہے مل جائیں تو ارشادِ مخدوم صاحبؒ کی تعمیل کیجائے۔ مزار پر بکثرت سے درویش نزدیک و دور کے حاضر ہوا کرتے تھے اور ہر ایک آنیوالے سے امیر مرحوم ملتے تھے اور اپنے مقصود کو جویا رہتے تھے۔ اسی اثنا میں اسی صورت کے ایک بزرگ جنکی تلاش تھی مزار پر انوار پر حاضر ہوئے۔ یہ درویش

امیر شاہ عــہ نام ریاست رامپور کے رہنے والے سلسلہ چشتیہ صابریہ کے شیخ تھے۔
امیر مرحوم نے انکو پہچان لیا اور بے اختیار اُن کی طرف متوجہ ہوئے میاں امیر شاہ
بھی اُن کو دیکھکر مسکرائے اور کہا کہ اب وقت تمہاری بیعت کا آگیا ہے غرض
اُن کے ہاتھ پر بیعت کی اور سلسلہ صابریہ کے اشغال میں حسب ہدایت شیخ مشغول ہوئے
امیر شاہ صاحب آستانۂ مبارک پر بہت عرصے تک مقیم رہے اور حسنِ اتفاق دیکھئے کہ
جب لکھنؤ مٹ گیا تو امیر رامپور ہی میں جا کے مقیم ہوئے جو اُن کے شیخ کا مسکن تھا۔
گویا یہ کشش شیخ ہی کیطرف سے ہوئی جب تک شیخ زندہ رہے دونوں یکجا رہے
اور امیر نے تمام مدارجِ سلوک طے کر کے خلافت نامہ شیخ سے حاصل کر لیا۔ آپ نے
مخصوص اشخاص کو مرید کیا اور سلوک کی تعلیم دی لیکن بوجہ مشغولیِ خدمتِ سلاطین سلسلہ
پیری مریدی بڑھایا نہیں۔

ابتدائے سلوک میں امیر پر ایسی محویت طاری ہوئی اور ایسا استغراق ہوا کہ
دنیا کے سب کام کاج سے معطل ہو گئے یہ حال دیکھ کے اُن کی والدۂ ماجدہ نے
شیخ کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ ایسی توجہ فرمائے کہ اس حالت میں سکون ہو اور

عــہ امیر شاہ صاحب علم و فضل میں اور بالخصوص درویشی میں بڑا مرتبہ رکھتے تھے، ان کے تصانیف میں ایک بڑی کتاب تعلیم الخواص ہے جو سلوک میں نہایت بسیط اور جامع اور سالکین کیلئے چراغ ہدایت ہے کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے فارسی میں ان کے اشعار زیادہ ہیں۔ اردو میں کم۔ ایک مشہور غزل اکثر سماع کی مجلسوں میں گائی جاتی ہے جسکے چند شعر یہ ہیں ؎

یہ جو صورت ہے تری صورتِ جاناں ہے یہی — یہی نقشہ ہے یہی رنگ یہی ساماں ہے یہی
بسترہ ٹاٹ کا دو پارچے کمل کی کلاہ — تاجِ خسرو ہے یہی تختِ سلیماں ہے یہی
اپنی ہستی کے سوا غیر کو سجدہ ہے حرام — مشربِ پیرِ مغاں مذہبِ رنداں ہے یہی

دنیاوی امور کیطرف بھی امیر متوجہ ہوں شیخ نے اپنی کلاہ سر سے اُتار کے بھیجی اور کہا کہ اِس کو امیر کے سر پر رکھو۔ اُس کلاہ کے رکھنے سے اُس حالت سے افاقہ ہوگیا اور استغراقی کیفیت میں جو شدّت تھی وہ جاتی رہی۔ امیر کو اُس کیفیت کے جانے کا صدمہ ہوا کیونکہ اسمیں لذت ہی اور تھی۔ اپنے پیر سے اسبارے میں عرض کیا۔ پیر نے فرمایا کہ تمہارا لطف جاتا نہیں ہے اس وقت مصلحت ایسی ہی تھی آئندہ یہہ کیفیت پھر عود کرآئے گی چنانچہ آخر وقت میں شیخ کے ارشاد کا ظہور اچھی طرح دیکھا گیا۔

مخدوم صاحب کے مزار پر سماع کا جلسہ ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے اور اب تک جاری ہے امیر مرحوم سماع کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے مگر رامپور میں کبھی نہیں دیکھا کہ سماع میں شرکت کی ہو بات یہہ ہے کہ درویش دو قسم کے ہوتے ہیں ایک ارباب تلوین کہلاتے ہیں اور ایک ارباب تمکین حضرت امیر کو لکھنؤ میں ارباب تلوین کی صحبت حاصل رہی لہذا سماع کے جلسوں سے فائدہ اٹھانے میں کچھہ تامل نہیں کیا۔ بخلاف اِس کے رامپور میں زیادہ تر صحبت ارباب تمکین کے ساتھہ رہی مثلاً میاں سید حسن شاہ صاحب محدث۔ میاں سید محمد شاہ صاحب محدث حضرت شاہ محمد معصوم صاحب نقشبندی وغیرہ سے مجاورت اور رات دن ملنا جلنا رہا لہذا زہد و ورع اور عزلت نشینی کے ساتھہ ریاضات ظاہری باطنی اور مراقبات و عبادات اور اتباع سنت و تلاوت قرآن میں مصروفی رہی۔ سماع کی طرف جانیکی ضرورت نہیں ہوئی۔

لذت سماع کی اسقدر تھی کہ جہاں کسی خوش گلو کو کچھہ پڑہتے سُن لیتے تھے بے اختیار ہوجاتے تھے۔ نعتیہ کلام اکثر لحن کے ساتھہ پڑھواتے تھے اور بجائے خود وجد کرتے تھے۔

حفاظ و قرار کے پڑھنے پر خاص کیفیت ہوتی تھی کہ بیان میں نہیں آسکتی جو حافظ مل جاتا تھا اُس سے فرمائش قرآن سنانیکی ہوتی تھی اور سفر و حضر میں ہر جگہ ہمیشہ یہی معمول رہا اور یہ لذت اُن کی روحانی قوت کا نتیجہ تھی۔

امیر مرحوم میں ایک معصومیت کی شان پائی جاتی تھی جو اعلیٰ درجہ کی درویشی اور فقر کی حالت میں علی العموم پائی جاتی ہے یعنی دنیا کی چالوں اور ترکیبوں اور دنیا سازی سے وہ بالکل ناآشنا تھے باوجودیکہ فراست ظاہری و باطنی اعلیٰ درجہ کی رکھتے تھے اور یہ معصومیت فطری تھی۔ بعض واقعات کے بیان میں بسبیل تذکرہ اُن کی زبان سے سُنا گیا کہ میں نے مدت تک نہیں جانا کہ روپیہ پیسے کی لوگ کیوں بہت قدر کرتے ہیں اور کیوں اُس کے تحفظ کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ میں ذی ہوش تھا۔ ایکمرتبہ میں نے بیرونی مکان کے طاق پر جہاں میری کتابیں رکھی تھیں زیادہ مقدار میں روپیے رکھدئے تھے ایک شخص کو معلوم ہوا تو اُس نے روپیہ چھپا کر لینا چاہا اتنے میں میں باہر سے آگیا۔ وہ شخص روپیے لیکر بھاگا اور کچھ روپیے زمین پر گر بھی گئے۔ میں نے جو یہ واقعہ دیکھا تو مجھ کو حیرت ہوئی کہ اس نے روپیے لیلئے تو چھپایا کیوں اور پھر بھاگا کیوں۔ کہتے تھے کہ مجھ کو بہت دنوں تک اسپر استعجاب اور تحیّر رہا اور یہ بھی اُن کی زبان سے سنا کہ مدت تک مجھے اس بات کا یقین نہیں ہوا کہ لوگ فریب بھی کرتے ہیں اور جھوٹ بھی بولتے ہیں۔

حصول سلوک کے اثنا میں ایک زمانہ ایسا گذرا ہے کہ اُن کی قوت خیالی بہت بڑی ہوئی تھی یعنی جس بات کا تصور جزم کے ساتھ کرلیتے تھے اُس کا ظہور فوراً ہو جاتا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے کہ گھر میں بہت عسرت تھی جو درویشی کی خاص شان ہے۔

اُس زمانے میں کبھی کبھی اُن کی والدہ کہتی تھیں کہ امیر آج نہایت تنگی ہے۔ یہ کہتے فلاں طاق پر روپیے رکھے ہیں۔ وہ اُس طاق سے روپیے لے لیتی تھیں۔ یہ واقعہ میں نے اُن کی زبان سے سُنا ہے۔

آپ کا سلسلۂ طریقت حضرت خواجہ بزرگ تک اس طرح پہنچتا ہے کہ امیر مینائی مرید اور خلیفہ میاں امیر شاہ چشتی صابری کے ہیں اور وہ خلیفہ غلام شاہ کے ہیں اور وہ شاہ عبدالکریم کے اور وہ شیخ عنایت جی کے اور وہ حضرت شاہ بھیک کے اور وہ شاہ ابو المعالی کے اور وہ شیخ داؤد کے اور وہ شیخ محمد صادق کے اور وہ شاہ ابو سعید کے اور وہ شیخ نظام الدین بلخی کے اور وہ شیخ جلال الدین تھانیسری کے اور وہ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے اور وہ شیخ محمد جی کے اور وہ شیخ عارف جی کے اور وہ حضرت شیخ احمد عبدالحق رُدولوی کے اور وہ شیخ جلال الدین کے اور وہ شیخ شمس الدین ترک پانی پتی کے اور وہ حضرت شیخ علاء الدین علی احمد صابر کے اور وہ بابا فرید گنج شکر کے اور وہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے اور وہ خلیفہ غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں۔

شاعری

قدرت نے یہ طے کر دیا تھا کہ ہونہار اور فاضل اجل امیر ایک زمانے میں ملک سخن کے بادشاہ ہوں گے اور امیر الشعرا کہلائیں گے اس لیے امیر کی طبیعت بہت کم سنی ہی سے شعر و سخن کیطرف مائل تھی ان کا زمانہ طالب علمی بھی شعر گوئی سے خالی نہ تھا اور اگرچہ انہوں نے ظاہر طور پر اشعار نہیں کہے لیکن اندر ہی اندر وہ شاعری کے مزے لے رہے تھے۔

علوم عربیہ کی تکمیل کے اثنا میں انہوں نے علم معانی و بیان اور ادب کی تحصیل اور اس کے نکات کے حل کرنے اور موشگافیاں کرنے میں زیادہ نام پایا۔ علم ادب کے استاد مولوی تراب علی صاحب کہتے تھے کہ ادب کا امیر ماہر کامل ہے، کچھ شک نہیں کہ شاعر کی طبیعت قدرت الہٰی کا مظہر ہوتی ہے اور اس پر انوار قدس کے تجلیات روشن ہو کر ایک خاص قسم کا سوز و گداز پیدا کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے جذبات باطنی کا اظہار شعر گوئی کی طرف کھینچ لیتا ہے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ لکھنؤ کی آب و گل میں مذاق سخن پڑا ہوا تھا، عہد شاہی میں شاعری بھی ہر دلعزیز اور اوج کمال پر تھی اور نظم میں دریا بہانے والے چاروں طرف نظر آتے تھے۔ ادنیٰ اور اعلیٰ کو یکساں مذاق تھا اور بادشاہ سے لیکر معمولی شخص تک شعر گوئی کا والہ و شیدا تھا۔ مزید براں حکومت کی قدر دانی اور سونے پر سہاگے کا کام کر رہی تھی اور اسیر، وزیر، انیس، دبیر وغیرہ کی موجودگی نے شاعری کے جسم میں تازہ روح پھونک دی تھی خود امیر مرحوم کے والد اور بھائی شعر کہتے تھے ایسی حالت میں امیر کا اس کم عمری میں شعر کہنا کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔

اگرچہ امیر پوشیدہ طور پر ابتدا میں شعر کہتے تھے اور کسی کو سناتے نہ تھے لیکن یہ بات پوشیدہ کیونکر رہ سکتی تھی۔ شدہ شدہ ان کے والد ماجد کو خبر ہو گئی چنانچہ ایک رات جبکہ گرمیوں کا زمانہ تھا اور چاندنی کھلی ہوئی تھی ان کے پیرانہ سال والد عشا کی نماز پڑھکر جا نماز پر لیٹ گئے۔ سعادتمند بیٹا پاؤں دبا رہا تھا۔ والد نے شفقت سے پوچھا کہ میاں امیر میں نے سنا ہے کہ تم شعر کہتے ہو میں بھی تو سنوں کہ کیسے شعر کہتے ہو۔ امیر نے شرم سے انکار کیا مگر اُدھر سے اصرار ہوا۔ بالاخر بصد ادب یہ شعر پڑھا اسوقت آپ کی عمر نو برس کی تھی ؎

ابر آتا ہے ہر بار برستا نہیں پانی
اِس غم سے مرے آنسوؤں کی ہے یہ روانی

والد بزرگوار ہونہار بیٹے کی طباعی کا اندازہ کر کے دل میں تو ضرور خوش ہوئے ہونگے مگر بہت دیر تک نصیحت کرتے رہے کہ بیٹا ابھی پڑھنے لکھنے کا وقت ہے علم و فضل حاصل کرو تاکہ خاندان کی عظمت قایم رہے۔ بعد فراغ تحصیل جب جی چاہے شعر کہہ لینا۔ سعادتمند بیٹے نے سکوت اختیار کیا مگر فطرتی جوش کہیں روکے سے رک سکتا ہے زمانۂ تحصیل علم ہی میں اُنھوں نے اس فن میں بڑی حد تک ترقی حاصل کی اور اُس قدرتی ذوق کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک طرف تو امیر مرحوم تحصیل علم میں مصروف تھے دوسری طرف شعر گوئی کا مشغلہ ترقی استعداد کے ساتھ بڑھتا گیا مولوی تفضل حسین فتحپوری کے مشاعروں میں آزادی کے ساتھ شریک ہونے لگے۔ مشاعروں میں امیر کے کلام نے بڑا نام پایا اور ہر دلعزیزی حاصل کی۔ اس مشاعرہ میں اکثر ذی استعداد اور کاملینِ فن شریک ہوا کرتے تھے درحقیقت امیر مرحوم کی شاعری کی ترقی کا آغاز یہیں سے ہوا اور ان کے اشعار کی چاروں طرف سے تعریفیں ہونے لگیں اور بیس پچیس شاعر اُن سے کلام میں اصلاح لینے لگے۔ آپ نے اپنا تخلص اپنے نام کے ایک جزو کو کیا تھا جسکو وہ بہت پسند کرتے تھے چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

نام کا نام تخلص کا تخلص ہے امیر   یہ بڑا حسنِ خداداد مرے نام میں ہے

ایک غزل کے مقطع میں حضرت نے اپنا پورا نام نظم کیا ہے۔

پیاس اسکی ہو بجھے کی تو مئے کوثر سے   ظرف عالی ہے امیر احمد مینائی کا

ایک اور شعر میں بطور سجع کے اپنا نام موزوں فرمایا ہے۔

اے امیر احمد مرسل کے جو ہیں چار وزیر — چار یاری ہوں مجھے ہیں یہ برابر چاروں

امیر کی یہ خداداد ذہانت اور فطرتی موزونیت تھی کہ وہ اسوقت تک بغیر کسی استاد سے اصلاح لئے مشاعرے میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ابتک انہوں نے کوئی استاد منتخب نہ کیا تھا لیکن شوقِ ترقی سخن نے انہیں ترغیب دلائی کہ کسی استاد سے اصلاح کلام کی درخواست کرنا چاہئے۔ چنانچہ بدبیر الدولہ مدبر الملک سید مظفر علی خاں بہادر اسیر کے سامنے اپنا کلام اصلاح کیلئے پیش کیا۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ امیر نے استاد کا کلام اور اُن کی قابلیت اور اُن کے طریقِ اصلاح کو دیکھکر اپنی استادی کے لئے انہیں منتخب کیا تھا جیسے جیسے وہ اپنے کلام میں اصلاح لیتے گئے یہ انتخاب قابلِ قدر ثابت ہوتا گیا۔

حضرت اسیر نے ہونہار شاگرد کی طرف نہایت توجہ کی اور اُن کی ذہانت اور طباعی کے گرویدہ ہو کر بزرگانہ شفقت کے ساتھ اصلاح دینے لگے جب امیر سا قابل شاگرد ملے اور حضرت اسیر سا استاد جو مراتبِ تحقیق میں کمال رکھتا ہو تو شاگرد کے کلام میں استاد کی اصلاح ایسی ہوتی ہے جیسے سرو و صنوبر کی پیرایش کے لئے باغباں کی والا نظری۔ یا چمن شاداب کی نشو و نما کے واسطے ابر بہاری کا ترشح یا آئینہ کی جلا کے لئے صیقل چنانچہ روز بروز کلام میں فرق نظر آنے لگا پہلی غزل جو استاد کے سامنے بغرض اصلاح پیش کی گئی اُس کا مطلع یہ ہے۔

دل میں اپنے جب خیالِ زلفِ جاناں ہو گیا
آنکھوں میں خوابِ پریشاں سنبلستاں ہو گیا

امیر مرحوم بیان کرتے تھے کہ جناب اسیر نے غزل دیکھکر فرمایا کہ سب شعر اچھے ہیں۔ اصلاح کی حاجت نہیں مجھے اُن کے فرمانے سے بجائے خود یہ گمان ہوا کہ

ان اشعار میں تصرف کی گنجایش نہیں ہے مگر اس پر بھی میں نے استاد سے اصرار کیا تھا
کہ آپ اس میں اصلاح دیں۔ وہ میرے خیال کو سمجھ گئے اور اکثر شعروں میں ایسا
تصرف کیا جسکی امید مجھے ہرگز نہ تھی۔

اس موقع پر امیر مرحوم کو ایسا خیال جو پیدا ہوا اسکی دو وجہیں قیاس کیجا سکتی ہیں
اوّل تو یہ کہ وہ غزل پیش کرنے سے پہلے اہلِ سخن سے اپنے کلام کی داد پا چکے تھے
دوسرے یہ کہ استاد کا فرمانا کہ اصلاح کی حاجت نہیں دال تھا کہ کلام میں سقم نہیں
مگر استاد کی نظرِ تحقیق نے شاگرد کے اصرار سے اپنا پایۂ استادی دکھا ہی دیا۔

اسیر کی استادی اور اصلاح سے امیر کا کلام جسقدر چمکا اُس کے بیان کرنے کی
مطلق حاجت نہیں مگر چونکہ وہ پہلے پہل اصلاح کے لیے آمادہ ہوئے تھے اور کبھی کسی
استاد سے مشورہ نہیں کیا تھا اسلیے اصلاحِ کلام کے حُسن و قبح سے ماہر نہ ہوئے تھے۔
جوشِ طبیعت سے جو کچھ کہتے تھے۔ اسکے الفاظ اور معانی کی صحت کا اندازہ علی معلومات سے
کرتے تھے مگر نشستِ الفاظ۔ ایک لفظ کی ترقی اور دوسرے لفظ کا تنزل ترکیب کی
خوبی وغیرہ کے اندازہ کرنے کا موقع نہ آیا تھا اور جیسا کہ ایک ذہین اور لایق شاگرد کا
طریقہ ہوتا ہے استاد کی ہر بات پر بجائے خود غور کرتے اور اُنھیں باریکیاں نکالتے تھے۔
چنانچہ امیر نے استاد کی اصلاح اور اصلی اشعار کو اپنے طور پر جانچا جسمیں کہیں کہیں اسیر کے
تصرفات کو ناپسند کیا۔ اس بارے میں امیر مرحوم کا بیان حسبِ ذیل تھا۔

"میری پہلی غزل میں جو اصلاح ہوئی سب تصرفات مجھے پسند نہ آئے
میں نے وجوہ تصرف کی نسبت کچھ کہنا چاہا اس پر جناب اسیر نے
فرمایا کہ تم اصلاحِ کلام جمع کرتے جاؤ چند روز کے بعد اس پر نظر ڈالنا

اور کوئی شبہ پیدا ہو تو مجھ سے دریافت کر لینا میں نے اسی پر عمل کیا
اصلاح لیتا رہا۔ اور اُس کو رکھتا گیا۔ ایک عرصہ کے بعد اُن تصرفات کو
دیکھا تو ایک ایک لفظ پر جی لوٹ گیا"

اُس زمانے میں جو لوگ ممتاز اور سربرآوردہ شاعر مانے جاتے تھے اُن میں خواجہ وزیر نہایت موقّر تھے۔ قاعدہ ہے کہ ہم فن اور ہم مذاق ہی کی صحبت پسند کی جاتی ہے امیر مرحوم بھی ابتدا ہی سے خواجہ وزیر کے پاس اکثر نشست و برخاست رکھتے تھے اوّل تو خواجہ وزیر باکمال شاعر تھے دوسرے یہ کہ اُن کا مکان بھی قریب ہی تھا یعنی ہم محلّہ تھے۔

کبھی کبھی امیر مرحوم خواجہ صاحب کے سامنے اپنا کلام بھی پڑھتے تھے۔ خواجہ صاحب اُن کی ذکاوت اور طبّاعی کے دلدادہ ہو گئے۔ بعض اوقات بطور پیشین گوئی کہتے تھے کہ یہ تھوڑے ہی زمانے میں شاعری کی دنیا کو آباد کریں گے اور اپنے اخوان پر گوئے سبقت لیجائیں گے۔

خواجہ وزیر کی خواہش تھی کہ امیر مجھ سے تلمذ اختیار کریں۔ مگر خواجہ صاحب کا طریقۂ اصلاح اچھا نہ تھا۔ وہ بجائے اشعار درست کرنے کے بیشتر خود اشعار کہکے غزل میں شامل کر دیتے تھے۔ اس طریقۂ اصلاح کو امیر مرحوم نے پسند نہ کیا۔
امیر جب حضرت اسیر کے شاگرد ہوئے تو خواجہ وزیر نے بزرگانہ شکایت کی کہ تم نے جو گرم طبیعت اور بلندی خیال پائی ہے اس کا مقتضیٰ یہ نہ تھا کہ تم اسیر کو اپنا کلام بغرضِ اصلاح دکھاؤ مگر امیر مرحوم تو بجائے خود پہلے ہی اس کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اِس گفتگو سے اُن کا خیال کیوں کر پلٹ سکتا تھا وہ اس کا امتحان کر چکے تھے کہ اسیر کا

مرتبۂ شاعری کیسا ہے۔ علمی سرمایہ اور فضل و کمال کی کیا شان ہے اور استاد کی محققانہ نظر شعر و سخن میں کہاں تک بڑھی ہوئی ہے۔

ایک مشاعرہ میں خواجہ وزیر اور حضرت اسیر بھی موجود تھے آمیر نے یہ شعر پڑھا

دل ہی نہ رہا امید کیسی
جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی

اس شعر پر امید سے بڑھکر امیر مرحوم کو داد ملی۔ خواجہ وزیر اس شعر کو سن کر بے اختیار بول اُٹھے "امیر بڑے خوش نصیب ہو خوب اسیر کیا"

اُستاد نے ڈیڑھ دو برس کے بعد اصلاح کی قید اُٹھادی تھی مگر امیر مرحوم باصرار برابر اپنا کلام دکھاتے رہے۔ اور جب تک حضرت اسیر زندہ رہے یہی عمل جاری رہا۔

تدبیر الدولہ حضرت اسیر شاہ اودھ کے میر منشیِ خاص یا پرائیوٹ سکریٹری تھے۔ اور مصاحب بھی تھے۔ اب امیر مرحوم اکثر اوقات انہیں کی خدمت میں رہنے لگے جتنی فرصت بڑھی اتنی ہی مشق سخن میں ترقی ہوئی بہت سا وقت تحقیق رموزِ فن میں صرف ہونے لگا اور استاد کے ساتھ فتح الدولہ برق۔ آفتاب الدولہ قلق مقبول الدولہ مقبول سے بھی صحبتیں گرم ہونے لگیں۔ یہ سب شعرائے نامور خوش لیاقت خوش فکر بالانشینِ دربارِ واجد علی شاہ تھے۔ اب امیر کی شرکت مشاعروں میں حوصلے اور دعوے کیساتھ ہونے لگی۔ ہر بار یہی ارادہ ہوتا تھا کہ مشاعرہ ہمارے ہاتھ رہے۔

ظفر الدولہ نواب علی اصغر خاں کے مکان واقع سرائے معالی خاں پر جلسۂ شعر اکثر رہتا تھا۔ حضرت امیر اکثر وہاں بیٹھا کرتے تھے اور اپنی غزلیں پڑھکر موردِ تحسین و آفریں ہوتے تھے، اسی جلسہ میں پڑھی ہوئی ایک غزل کی بیحد تعریف کی گئی جسکا مطلع یہ ہے۔

بہار آئی عجب حالت ہے ان روزوں مرے دل کی
جگر میں چٹکیاں لیتی ہیں منقاریں عنادل کی

دوسرا مشاعرہ نہایت اہتمام اور دھوم دھام سے نواب غضنفر الدولہ بہادر داماد نواب محمد علیشاہ کے مکان پر منعقد ہوتا تھا اور اس میں بھی امیر اکثر شریک ہوکر طرحی غزلیں سناتے تھے۔ اسی مشاعرے کی غزل کا مصرع طرح یہ ہے

بڑی سرکار میں پہونچے بڑے دربار میں آئے۔

امیر کی طباعی۔ نازک خیالی معنی آفرینی اور قدرت کلام نے اسوقت کے نامور شعرا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا اور شعرا کے حلقہ میں انکی قدر بڑہتی گئی۔

مرزا رجب علیبیگ سرور مصنف فسانہ عجائب امیر کے گہرے دوست تھے۔ اکثر مرزا صاحب کے مکان پر امیر کی نشست و برخاست رہتی تھی منشی سلیم الزماں صاحب خواہرزادہ امیر مینائی بیان کرتے تھے کہ میری عمر اُس وقت گیارہ برس کی ہوگی میں بھی اکثر حضرت امیر کے ہمراہ سرور کے مکان پر جاتا تھا اور شعر و سخن کے تذکرے ہوتے تھے۔ رجب علی بیگ سرور اسی زمانہ میں فسانۂ عجائب کی تالیف میں مصروف تھے چنانچہ جس قدر وہ روزانہ لکھتے تھے امیر صاحب کو سنایا کرتے تھے۔

مشاعرے میں امیر کا معمول تھا کہ طرحی غزل کے علاوہ ایک غزل غیر طرح پیش خوانی میں پڑہتے تھے۔ نسیم دہلوی کے فرزند نے یہ ڈہنگ اختیار کیا کہ جس زمین میں امیر پیش خوانی کی غزل پڑہتے اسی زمین میں وہ بھی غزل کہتے اور آیندہ مشاعرے میں پڑہتے۔ جبتک یہ سلسلہ قایم رہا امیر کو ناگوار ہوا اور ناگوار ہونے کی بات ہی تھی آپ نے اپنے استاد سے اس کا ذکر کیا انہوں نے رائے دی کہ تم ایک ہی زمین میں

مسلسل غزل پڑھتے جاؤ دیکھو وہ کہاں تک چلتے ہیں غرض امیر نے ایک طرح میں کئی سو شعر کہہ لیے اور ہر مشاعرے میں ایک ایک غزل پڑھنی شروع کی دو تین مشاعرے تک تو نسیم کے صاحبزادے نے بدقت وضعداری کو نباہا - آخر معذرت کی اور یہ سلسلہ ختم ہوگیا ۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ شیخ ناسخ انتقال کر چکے تھے ۔ آتش موجود تھے لیکن انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر کے شاعری ترک کر دی تھی ۔ البتہ شیخ ناسخ اور آتش کے نامور شاگرد چمنستانِ سخن کی آبیاری کر رہے تھے ۔ دوسری طرف مرزا دبیر اور میر انیس کی مقابلتہً مرثیہ گوئی تمام اہلِ سخن کو اپنی طرف متوجہ کیے ہوئے تھی ۔ انیس و دبیر کی معرکہ آرائیاں شعرائے موجودہ کے شوقِ سخن کو اور تیز کر رہی تھیں ۔ اُس وقت اکثر غزل گو شعرا نے مرثیہ میں تو قدم نہیں رکھا مگر واسوخت کی تصنیف میں طبع آزمائی کی ان میں سے سحر کے کئی واسوخت و امانت خاص طور پر پسند کئے گئے ۔ حضرت اسیر نے لوگوں کی فرمایش سے مرثیہ کی طرف توجہ کی ۔ بہت سے مرثیے کہہ ڈالے مگر رکھا ایک بھی نہیں ۔ امیر نے بھی نہایت دھوم سے واسوخت تصنیف کئے چنانچہ سات واسوخت یکے بعد دیگرے انھوں نے کہے جنہیں سے چھ واسوخت مطبع نولکشور لکھنؤ میں طبع ہوئے ہیں ۔ پانچویں واسوخت میں امیر نے سراپا لکھنے میں کمال دکھایا ہے اور ایک بند میں وابروکی تشبیہ میں ایسا کہا کہ تمام معاصرین تحسین و مرحبا کہہ اُٹھے ۔

اس واسوخت کے قبل صرف دو تشبیہیں مینی وابرو کی کہی گئی تھیں ایک تو مرزا دبیر نے کہی تھی اور دوسری میر انیس نے ۔

مرزا دبیر کا مضمون یہ ہے کہ ایک علم ہے اور اُس کے اوپر دو تلواریں آویزاں ہیں ۔ قاعدہ ہے کہ بعض بڑے علم جو نکالے جاتے ہیں اُن کے سرے پر دو جانب دو تلواریں

آویزاں کیجاتی ہیں اور میر انیس نے کہا ہے کہ بینی ایک روشن شمع ہے اور کوچہ زلف سے جب ہوا آتی ہے تو اس سے شمع کی لو کبھی اِدھر جھک جاتی ہے اور کبھی اُدھر یعنی شمع کی لو کا دو جانب جھکنا ابرو کی صورت پیدا کرتا ہے۔ بہت ہی نازک خیالی کیگئی ہے۔

اِن دونوں تشبیہوں سے جداگانہ پہلو امیر نے نکالا ہے ۔

چاندنی رات ہے افشاں سی وہ گیسوے سیاہ — دیکھنے ہوں جسے تارے وہ کرے خوب نگاہ
ایسا مضمون بندھے ابرو و بینی کا کہ واہ — نوبتیں بجنے لگیں سب کہیں سبحان اللہ
واہ کیا شکلیں ہیں قابل ہیں یہ تصویر و کے — دیکھو نکلی ہے زچہ سائے میں شمشیروں کے

یہ ایک قدیمی رسم ہے کہ زچہ جب اوّل اوّل زچہ خانے سے تاروں کی چھاؤں میں باہر نکالی جاتی ہے تو دونوں طرف سے اُسپر برہنہ تلواروں کا سایہ کیا جاتا ہے۔

گویا بینی ایک زچہ ہے اور دونوں ابرو تلواریں ہیں کہ بینی کو اپنے سائے میں لئے ہوئے ہیں۔

اس عجیب و غریب تشبیہ کی ہر طرف سے داد دی گئی۔ چنانچہ میر انیس تک جب یہ بند پہونچا تو وہ امیر کی طباعی اور نازک خیالی کو دیکھکر اسقدر خوش ہوئے کہ اپنے ایک عزیز کو امیر کے مکان پر بھیجا اور یہ پیغام دیا کہ اب تک صرف دو تشبیہیں ہوئی تھیں ایک مرزا دبیر نے کہی تھی اور ایک میں نے مگر آپ نے جو جدید اور نازک تشبیہ پیدا کی ہے اس پر میں آپکو مبارکباد دیتا ہوں۔

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ امیر مرحوم واجد علی بادشاہ کے سکرٹری اور اُن کے مصاحب خاص تھے۔ امیر کی گرما گرم طبیعت کو دیکھ کر انھوں نے خیال کیا کہ دربارِ شاہی میں امیر کو لیجانا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے امیر سے اس کا ذکر کیا کہ کوئی قصیدہ مدحیہ تیار کرلو تو

میں تم کو بادشاہ کے پاس لے چلوں گا۔ امیر نے اس گفتگو کے قبل بھی چند قصاید اور مسدسات مدح میں کہے تھے اور ایک فارسی کی نہایت لطیف اور عجیب صنعت کی مثنوی کہی تھی کہ کہیں الفاظ کے نیچے نقطے ہیں اور کہیں سلسل اوپر ہی نقطے ہیں کہیں ہر مصرع تاریخ پر مشتمل ہے کہیں اشعار منقوط ہیں کہیں غیر منقوط۔ مگر کسی کے پیش کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔

اس موقع پر امیر نے بجائے قصیدہ کہنے کے کبوتر نامہ لکھا کیونکہ واجد علی شاہ کو کبوتروں کا نہایت شوق تھا۔ الغرض اسیر اپنے لایق شاگرد کو ایک روز قیصر باغ میں کہ شاہی جلوہ گاہ تھا لیگئے یہ واقعہ ۱۲۶۹ھ کا ہے۔ امیر مرحوم بیان کرتے تھے کہ یہ گرمیوں کا مہینا تھا دیوانِ عام میں جس کو مصاحب منزل کہتے تھے پہونچکر استاد اور میں دونوں ٹھہر گئے اور استاد نے شاہی خواجہ سرا کو بلوا کر کچھ کہا تھوڑی دیر کے بعد خواجہ سرا پھر آیا اور اس نے مجھ سے کہا کہ چلئے جہاں پناہ یاد فرماتے ہیں میں کچھ خوف زدہ کچھ متحیر کہ یہ پہلا موقع ہے ایسا نہو آدابِ شاہی کے خلاف کوئی بات ہوجائے خواجہ سرا کے ساتھ چلا۔ اسیر اسی جگہ ٹھہر گئے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد کئی درجے طے کرکے میں ایک نہایت عالیشان کمرے میں پہونچا جہاں کہ شاہ اودھ باجاہ وجلال جلوہ افروز تھے وہ ایوان فلک نشان ساون بہادون کے نام سے موسوم تھا؛ اس کی چھت سے ننھی ننھی پھوہار پڑتی تھی۔ برسات کا سماں تھا اور تمام مکان سرد ہو رہا تھا۔ سلطانی جلوہ گاہ کی آرایش وزیبایش وہاں کا سامان اور ٹھاٹھ اور چمک دمک اور خدامِ ذکور واناث کے زرق برق لباس غرض ایک ایسے برق سوز نظارے سے دفعتہً سابقہ پڑا کہ میری نگاہ خیرہ ہوگئی میں متحیر ہو گیا کہ کیا کروں اتنے میں خواجہ سرا آگے بڑھکر باآواز بلند پکارا

"آداب بجالاؤ" میں ہوش و حواس درست کرکے باقاعدہ آداب بجالایا اور بڑھ کر نذر پیش کی۔

بادشاہ نے ارشاد کیا کہ تمہارا ہی نام امیر ہے۔ میں نے دست بستہ عرض کیا جہاں پناہ فقیر ہی کو امیر کہتے ہیں اسکے بعد کبوتر نامہ جو خوشخط لکھا ہوا پاس موجود تھا ادب سے پیش کیا بادشاہ کبوتر نامے کو لے کر نہایت خوش ہوئے اور کچھ دیر تک اس کو ملاحظہ فرماتے رہے اور حکم دیا کہ صلے میں خلعتِ فاخرہ عطا کیا جائے چنانچہ مجھ کو خلعت مرحمت ہوا جسمیں ایک پالکی بھی تھی میں اداب بجالاکر رخصت ہوا۔

اُس وقت امیر کی عمر پچیس برس کی تھی اور یہ دربار میں حاضر ہونے کا پہلا موقع تھا۔

اس باریابی کے چند دن بعد بادشاہ نے امیر کی لیاقت اور شاعری سے خوش ہوکر فرمایا کہ شہزادہ نادر مرزا کو تعلیم دیں۔ چنانچہ منشی سلیم الزماں صاحب بیان کرتے تھے کہ شہزادہ کی تعلیم کے لئے عشق منزل میں قیام تجویز ہوا تھا۔ میں بھی دس پانچ مرتبہ ساتھ گیا ہوں۔ امیر نے شہزادہ کو پڑھانے کے لئے انشائے نادری لکھی تھی۔

واجد علی شاہ کے دربار کی رسائی اور شاہی تعلقات نے اُن کی شہرت اور ناموری کو اور چار چاند لگادیے۔ ان کی وقعت تمام مقربان شاہی اور امرائے ملک میں بڑھ گئی اور ہر جگہ وہ عزت و توقیر کے ساتھ لیے جانے لگے۔

عشق منزل میں شہزادہ کو تعلیم دینا شروع کیا تھا کہ امیر کو شاہی فرمان ملا کہ خاص کچہری (عدالت دیوانی) تمہارے متعلق کیگئی۔ چنانچہ وقت معینہ پر تعلیم دینے میں مصروف رہتے اور عدالت کا کام بھی انجام دیتے تھے۔

اگرچہ امیر مینائی نے اب دنیا کے کاروبار میں قدم رکھا تھا اور ملازمت سرکاری نے

اُن کو بہت کچھ فراغت کر دیا تھا لیکن تصنیف و تالیف اور شعر گوئی کا مشغلہ اسی ذوق و شوق اور سرگرمی کے ساتھ جاری رہا جیسا کہ پہلے تھا۔

اس کے علاوہ انھوں نے شاہ اودھ کی ایک کتاب "رسوم بہ صوت المبارک" کی شرح لکھی اور اس کا نام نغمۂ قدسی رکھا۔ یہ گراں بہا تالیف بہ پیشگاہ شاہی بہت پسند کی گئی۔

مطالعہ کتب میں امیر کا بیشتر وقت صرف ہوتا تھا وہ ان تمام کاموں کے ساتھ سنسکرت کا مطالعہ بھی کرتے تھے اور انھیں اس قدر معلومات مہیا کی تھی کہ سنسکرت کے استادوں کے کلام کی ایک شرح بھی انھوں نے اردو میں تالیف کی۔ ساتھ ہی ساتھ شعر و سخن کا مشغلہ بھی جاری رکھا اور اب کہ دربار شاہی کے متوسلین میں شمار ہوتے تھے کوئی مشاعرہ لکھنؤ کا ایسا نہ تھا جس میں وہ شریک نہ ہوتے ہوں۔

باوجود اس اعزاز کے امیر کے درویشانہ عادات و خصائل میں جو انہیں ورثہ میں ملے تھے کوئی فرق نہیں آیا۔ اور ریاضات روحانی کی مشق بھی جاری تھی۔ وہ اکثر مقابر اولیاء پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ رودلی شریف میں سالانہ عرس حضرت شیخ احمد عبدالحق قدس سرہٗ کا نہایت دھوم دھام سے ہوتا تھا وہاں امیر مینائی بھی پابندی کے ساتھ ہفتہ عشرہ کیلئے حاضر ہوا کرتے تھے۔ رودلی کے مخدوم زادے شاہ محمود احمد صاحب بیان کرتے تھے کہ ہم لوگ امیر کی آمد کے نہایت مشتاق رہتے تھے اور عرس کے قریب آتے ہی اُن کے قیام کا عمدہ انتظام کرتے تھے جب وہ تشریف لاتے تو ہمارے اصرار سے شعر و سخن کا مشغلہ بھی ہوتا تھا اور یہیں مصرع طرح تجویز کیا جاتا اور مشاعرہ ہوتا۔ اور ہم چند لوگ جو شاعری سے شوق رکھتے تھے امیر سے اصلاح لیتے تھے۔ انکی اکثر غزلیں

جگر کس کا ہے اثر کس کا ہے اور سنبھل جاتے مچل جاتے رد ولی ہی کے مشاعرے کی ہیں
اور شاہ صاحب موصوف یہ بھی فرماتے تھے کہ امیر کی بہت سی غزلیں جو ہمارے سامنے
کہی تھیں دیوان میں نظر نہیں آتیں غالباً وہ ہنگامۂ غدر کے نذر ہوئیں چنانچہ یہ غزل
انہیں کی ہے جو زبانوں پر ہے ؎

جتنا جی چاہے ستا لے ستم ایجاد مجھے	مرغ تصویر ہوں آتی نہیں فریاد مجھے
آ کے تربت پہ بہت روئے کیا یاد مجھے	خاک اڑانے لگے جب کر چکے برباد مجھے

۱۲۷۴ھ میں حسب الحکم شاہ اودھ دو کتابیں امیر نے تصنیف کیں جن کا نام ہدایۃ السلطان
اور ارشاد السلطان ہے۔ جب یہ دونوں کتابیں بادشاہ کے روبرو پیش ہوئیں تو خوش ہو کر
شاہانہ نوازش مبذول فرمائی اور خلعت فاخرہ عطا فرمایا۔
ایک دن بادشاہ نے سر دربار امیر سے فرمایا کہ اس مضمون کا شعر فی البدیہہ کہو:
"معشوق نے میری تواضع حقہ سے کی اور
رقیب کو بوسہ دیا۔ کیا بے انصافی ہے"
امیر نے اسی وقت فکر کی اور یہ قطعہ موزوں کر کے سنا دیا جس پر بڑی
تحسین و آفرین ہوئی۔

قطعہ

مجھکو حقہ دیکے رالا غیر کو بوسہ دیا	دیکھتا جا اُدھر سے دمباز اپنے طور کو
کس کا حصہ دیدیا کسکو ذرا انصاف کر	دودھ بے حلوا مجھے حلوا سے بے دودھ اور کو

بادشاہ ایک روز گلی (ایک قسم کا حقہ) پی رہے تھے۔ امیر سے ارشاد ہوا کہ گلی کی تعریف
میں کوئی شعر ہونا چاہیے۔ امیر نے فی الفور تعمیل ارشاد کی اور یہ قطعہ پیش کیا۔

قطعہ

ساقیا پھول سے کیا کام کلی پیتے ہیں
جسکی بو ہمسری نشۂ مل کرتی ہے
دیکھنے میں تو ہی اک شاخ مگر واہ رے شاخ
دہن تنگ کو غنچہ کبھی گل کرتی ہے

امیر مینائی کے لئے اب پریشانی کا وقت آتا ہے یعنی انتزاع سلطنت اودھ کی کارروائی اسی سال کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے عمل میں لائی گئی اور اُس کا نتیجہ ہوا کہ تمام مقربان و متوسلان شاہی منتشر ہو گئے۔ بہت سے لوگ تو معزول شاہ کے ساتھ کلکتہ چلے گئے اور بہت رہ گئے۔ اس واقعہ قیامت خیز سے امیر بھی بہت متاثر ہوئے اسکے بعد ہی ۱۸۵۷ء کا غدر شروع ہوا اور اسکی چنگاریوں نے تمام ہندوستان میں آگ لگا دی۔ لکھنؤ بھی کہ اُس وقت واجد علی شاہ کی معزولی پر ماتم کدہ تھا باغیوں کے زیر اثر آگیا اور اس کا نتیجہ لکھنؤ کی عام بربادی اور تباہی ہوا۔

اس طوفان غدر کے برپا ہوتے ہی لکھنؤ کے باشندے متفرق ہونے لگے اور اکثر اپنی حفاظت کے لئے جدھر موقع ملا چلے گئے۔ چنانچہ امیر مینائی نے بھی سراسیمگی کی حالت میں مکان اور اثاث البیت کو چھوڑا۔ اور سب مرد و زن کسی گاؤں میں چلے گئے اور غدر کے فرو ہونے تک وہیں قیام پذیر رہے۔

جب غدر کا انسداد اور قیام امن کی خبریں چاروں طرف پھیل گئیں تو بھاگے ہوئے لوگ اپنے اپنے مکانات کو واپس آنے لگے۔ مگر امیر مینائی سیدھے کاکوری گئے اور وہیں ٹھہر گئے کاکوری سے ایک دن اپنے مکان کی حالت دیکھنے لکھنؤ آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ تمام محلہ مینا بازار میں آگ لگی ہوئی ہے اور مکانات جل رہے ہیں۔ ان کا مکان بھی جل کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ امیر کا بیان حسب ذیل ہے۔

"اس عام تباہی اور بربادی میں خاص اپنی مصیبت اور جگر کے جل جانے کا"
"خیال میں نے نہیں کیا۔ البتہ مجھے اس کا بے حد قلق ہوا کہ میرا ایک قلمی دیوان جو بہت"
"خوشخط اور مطلا و مذہب تھا اور متعدد تصانیف کے قلمی نسخے ضائع ہو گئے مگر اس امید پر"
"کہ شاید کوئی صندوق محفوظ رہا ہو تلاش کرنے لگا۔ ایک ڈھیر کے نیچے چند مسودات کا"
"پلندہ ہاتھ آیا جو بالکل منتشر اور خراب ہو گیا تھا میں اسی کو لے کر کف افسوس ملتا ہوا"
"کاکوری واپس ہوا۔"

کاکوری میں ایک برس قیام رہا اور یہاں شاہ تراب علی صاحب شیخ وقت اور ان کے صاحبزادے مولانا تقی علی صاحب جو کہ فاضل اجل اور عالم باعمل تھے صحبت رہی۔ ان کے علاوہ مولوی محمد محسن صاحب کاکوروی مرحوم نعت گوئی میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور شعر و سخن کا انکو نہایت شوق تھا ان کے ساتھ مشغلہ شاعری ہوتا رہا۔ مولوی محمد محسن صاحب کی صحبت سے امیر کو بہت لطف آیا اور امیر کی صحبت سے مولوی صاحب موصوف کو دلچسپی رہی۔

مولوی محمد محسن صاحب صرف نعت شریف کہتے تھے جس میں تائید الٰہی و فیض حضرت رسالت پناہی ایسی نازک خیالی اور بلندی دکھائی کہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی تھی اسی دوران میں محسن مرحوم نے شہیدی کے اس مشہور قصیدے پر جو سب کو یاد تھا روح الامین کو بھی خوشامد کا بڑے زور کا قصیدہ کہا کہ زمین شعر کو عرش پر پہونچا دیا۔ امیر نے اس قصیدے پر مصرع لگا کے مخمس کیا اور حق یہ ہے کہ ایسے بلند قصیدہ نعتیہ پر مصرع لگانا امیر ہی کا کام تھا۔ مولوی محمد محسن صاحب امیر کی قوت فکر پر بے حد خوش ہوئے اور کہا کہ آپ کے مصرعوں سے میرے قصیدے کی شان دو بالا ہو گئی یہ قصیدہ (۱۰۵) شعر کا ہے اس کے بعد امیر نے اسی قصیدے پر خود قصیدہ کہا۔ ظاہر ہے کہ شہیدی اور مولوی

محمد محسن کی فکر کے بعد اس زمین میں گنجایش ہی کیا رہی تھی مگر امیر کی طبع رسا نے ایسی غواصی کی کہ بحر معانی سے اپنے حصے کے موتی نکال ہی لیے امیر کا قصیدہ (۱۲۸) شعر کا ہے۔ اور پھر اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ ایک دو غزلہ بھی اسی زمین میں کہا۔ مولوی صاحب موصوف کہتے تھے کہ امیر صرف شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ مویدمن اللہ ہیں اور یہی قول مولوی محمد محسن کی نسبت امیر کا تھا۔

امیر مینائی کا کوئی بلاوا نہ تھا کہ رامپور سے منجانب نواب یوسف علیخاں بہادر اُن کی طلب ہوئی اور وہ رامپور کو روانہ ہوئے اس طلبی کے وجوہ یہ تھے کہ جنت آرامگاہ نواب محمد سعید خاں والی رامپور ایک زمانہ میں عرصہ تک لکھنؤ میں رہے تھے اور اُن کے ساتھ اُن کے صاحبزادے نواب یوسف علیخاں بھی تھے جنکی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی مولوی کرم محمد صاحب والد ماجد امیر مینائی اُن کے استاد تھے اور انہیں نے کتب درسیہ کی تعلیم دی تھی جب نواب یوسف علیخاں بہادر ۱۲۷۱ھ میں سریرآرائے حکومت ہوئے تو اُن کو شاعری کی طرف رُجحان پیدا ہوا اُستادی کے لئے مرزا غالب کو انتخاب کیا مرزا غالب کبھی دلی میں رہتے تھے اور کبھی رامپور آتے تھے۔ ایک وقت مومن مرحوم بھی رامپور میں وارد ہوئے تھے اُن کی شاعری کو بھی نواب یوسف علیخاں بہادر نے بہت پسند کیا اور انکو بھی کچھ کلام دکھایا۔ غالب کو اس کے بعد منتخب کیا تھا۔

اسی اثنا میں امیر کی شاعری کا غلغلہ رامپور تک پہنچا۔ نواب صاحب کو تفتیش ہوئی کہ یہ امیر کون ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ امیر مولوی شیخ کرم محمد صاحب کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ نواب صاحب نہایت خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ تو ہمارے استادزادے ہیں۔ ہمکو انہیں کے والد بزرگوار نے تعلیم دی ہے۔ ہمارا اُن پر حق ہے اور اُن کا حق

ہم پر ہے۔ الغرض نواب صاحب موصوف کا طلب کرنا امیر کے لئے بشارتِ غیبی ہوا اور یہ بڑی خوشی کے ساتھ رامپور تشریف لے گئے اُسوقت امیر کی عمر بتیس سال کی تھی اور ۱۲۷۵ھ آخر تھا۔

جب امیر مرحوم واردِ رامپور ہوئے اور شرف باریابی بندگانِ حضور حاصل کیا تو نواب صاحب نہایت محظوظ ہوئے اور فرمایا کہ آپ کیا ملے گویا میرے استاد ملے۔ یہ اشارہ تھا امیر کے والد مغفور کی طرف۔ امیر نے مدح میں ایک قصیدہ سنایا۔ نواب صاحب نے بہت تعریف کی اور فرمایا کہ میں آج ہی سے اس کے صلہ میں عدالت دیوانی کا حاکم اعلیٰ یعنی مفتی مقرر کرتا ہوں۔ علاوہ اس معزز عہدہ کے اپنا مصاحب بھی بنایا۔ الغرض نواب صاحب کیطرف سے اسقدر مراعات اور الطاف وعنایات ظہور میں آئے کہ انتزاعِ سلطنت لکھنؤ کے بعد جس قدر پریشانیاں امیر نے اٹھائی تھیں اُن کی تلافی ہوگئی۔ سرکاری مکان رہنے کو دیا گیا اور خدام وسپاہی مقرر کردیئے گئے مقصود یہ تھا کہ امیر لکھنؤ کو فراموش کرکے رامپور ہی کو اپنا مسکن بنائیں۔ اور یہی ہوا۔ امیر مینائی عدالت دیوانی کے انفصالِ مقدمات میں نہایت تندہی کے ساتھ مصروف رہتے تھے اور وقت معینہ پر نواب صاحب کی مصاحبت بھی کرتے تھے۔

امیر نے دربار رامپور میں باریاب ہوتے ہی اپنے استاد اسیر کو یاد کیا۔ یعنی نواب صاحب کی خدمت میں ایسی تحریک کی کہ انھوں نے اسیر کی طلبی کا حکم فوراً جاری کردیا۔ یہ گویا امیر نے حق شاگردی اپنے استاد کے ساتھ ادا کیا۔ اب کیا تھا اسیر بھی رامپور آگئے۔ شاعری کی صحبتیں گرم جوشی کے ساتھ ہونے لگیں۔ نواب صاحب نے اپنے کلام میں اسیر سے اصلاح بھی لی۔ چنانچہ امیر مرحوم تذکرہ انتخاب یادگار میں

لکھتے ہیں۔

منشی مظفر علی صاحب اسیرؔ کو جو آج لکھنؤ میں سحبان عصر اور یکتائے دہر ہیں
نواب موصوف کلام دکھانے لگے۔ پایۂ شاعری کو ایسا بلند کیا کہ روح القدس نے
بھی پسند کیا دو بار آپ کے نتائج افکار مطبع حسنی رامپور میں طبع ہوئے ہیں۔
اول مرتبہ دیوان مختصر جو صرف مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کا دیکھا ہوا تھا چھپا ہے
اور دوسری مرتبہ وہ کلام جو منشی مظفر علی صاحب امیرؔ کی نظر سے گزرا تھا
کلام اولین میں شریک ہو کر طبع ہوا ہے"۔

امیرؔ تو بالاستقلال مع متعلقین رامپور میں مقیم ہو گئے مگر اسیرؔ مثل غالبؔ کے کبھی رامپور میں رہتے تھے اور کبھی لکھنؤ میں، چونکہ اسیرؔ کا قیام رامپور میں مسلسل نہیں رہتا تھا لہٰذا کچھ دنوں کے بعد نواب صاحب نے اپنے کلام میں امیرؔ سے مشورہ کرنا شروع کیا اس کا ذکر امیر اللغات کے دیباچہ میں امیرؔ نے کیا ہے۔

"اس زمانے میں رامپور کی عدالت دیوانی مجھ سے متعلق تھی اور نواب"
"فردوس مکان اپنے کلام میں مشورہ بھی فرماتے تھے۔"

امیرؔ کے واسوخت ملاحظہ کر کے نواب صاحب کو بھی واسوخت کہنے کا شوق ہوا چنانچہ ایک واسوخت بہاریہ انھوں نے کہا اور امیرؔ کو دکھایا۔ اس واسوخت میں اول سے آخر تک بہار کا تلازمہ باندھا ہے اور خوب نباہا ہے۔ حق یہ ہے کہ امیرؔ نے بھی اصلاح میں ایسی توجہ کی کہ پورا واسوخت بہار کے سانچے میں ڈھل گیا۔ نواب کا شوق اس سے اور بڑھا۔ متواتر چار واسوخت کہے اور وہ چاروں مطبع نول کشور لکھنؤ میں مجموعۂ واسوخت موسوم بہ شعلۂ جوالہ میں طبع ہوئے جو قابل دید ہیں اور امیرؔ کے رنگ کی جھلک دکھا رہے ہیں

نواب صاحب ممدوح ۱۲۸۱ھ میں بعارضۂ سرطان علیل ہوئے شوال کے مہینے میں نوروز کے دن غسل صحت کیا اور باغ بے نظیر میں جشن منایا گیا۔ حضرت امیر نے غسل صحت کے موقع پر یہ قطعہ پڑھا ؎

شرف وال مصر کو ہی یاں عروج ماہ دولت ہے | عجب صحت عجب جلسہ عجب شادی کی ساعت ہے
کسے سال ہمایوں ہاتھ آتا ہے امیر ایسا | مہینہ عید کا نوروز کا دن غسل صحت ہے

۶ ۱۸ ۶۵

افسوس ہے کہ مرض کا استیصال اچھی طرح نہ ہوا تھا طبیعت پھر ناساز ہوگئی اور ۲۲ ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء جمعہ کے دن ٹھیک بارہ بجے انتقال فرمایا۔ حضرت امیر پر اس واقعہ کا جو اثر ہوا ظاہر ہے اور آپ نے اپنے جذبات دلی کو اسطرح ظاہر فرمایا ہے۔

در فراق ناظم معجز بیاں یوسف لقا | جوش زد سیلاب خوں از دیدۂ گریان من
تاب از دل رفت و دل از دست و دست از کار رفت | رفتن او جملہ برہم زد سر و سامان من
تیرہ شد چوں شام ماتم در نظر ایں خاکداں | چاک شد مانند داماں سحر دامان من
شکر نعمتہائے او ایماں خود دانستہ ام | ذکر او تا بودہ ام بودست کنز جان من
بسکہ از شور فغانم محشرے برپا شدست | می شود شور قیامت ہر نفس قربان من
گریہ ام در ماتمش تنگ فراوانی گرفت | می چکد طوفان نوح از گوشۂ دامان من

بہر سال آن عزیز مصر دلہا گفت امیر
مسند آرائے جناں شد یوسف دوران من

۱۲ — ۸۱ھ

نواب کلب علیخاں کی مسند آرائی

نواب یوسف علیخان نے وفات سے پہلے نواب کلب علیخاں بہادر کو نصیحت
کی تھی کہ اپنے دادا کے انتظامات کو بحال رکھنا جس کو ہم نے بحال رکھا ہے اور اُنکی
وصیت کو پیش نظر رکھکر نظم و نسق ریاست میں خلل دینا جس وقت میرا دم نکلے لاش
چھوٹے صاحب (کاظم علیخان) کے سپرد کرنا اور تم فوراً مسند حکومت پر بیٹھ جانا۔ نواب
کلب علیخاں نے ایسا ہی کیا کہ جنازہ چھوٹے صاحب کے سپرد کیا خود مسند نشین ہو گئے
اور چونکہ جمعہ کا دن تھا مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے۔ سید رستم علی صاحب پیش امام نے
ایسا عبرت انگیز خطبہ پڑھا کہ نواب کلب علیخان رو دئے۔ بعد ختم نماز جب ایوان حکومت
میں تشریف لائے تو تمام اہلکاروں اور ملازموں کو جمع کر کے سب کی تشفی کی اور سب کو اطمینان
دلایا تاکہ کوئی پریشان نہ ہو۔ ۱۰ رجون ۱۸۶۵ء کو مسٹر جان انگلس ایجنٹ نے
رام پور آکر دیوان خاص میں گورنمنٹ کی جانب سے باضابطہ مسند نشین کیا اور حضرت
امیر نے یہ قطعہ پڑھا۔

قطعہ تاریخ مسند آرائی

آفتاب سپہر حشمت نے	تخت پر جب جلوس فرمایا
فرط بالیدگی سے وقت جلوس	پایۂ عرش تخت نے پایا

عرشیوں نے کہا مبارک ہو — فرشیوں کے سروں پہ یہ سایا
سایہ اس سایۂ الٰہی کا — ابرِ رحمت کی طرح سے چھایا
تختِ دولت پہ ماہِ دولت نے — مہر ہو کر جلوس فرمایا
مہر کا رنگ ہو گیا پھیکا — ماہِ کامل فلک پہ شرمایا
نذر کو آسماں درِ انجم — طبقِ ماہتاب میں لایا
نور سے طور ہو گئی ... کوٹھی — پرتوِ حسن نے یہ چمکایا
کیوں نہ خوش ہوں محمدی مشرب — عہدِ خُلقِ محمدی آیا
اس سلیماں نے خُلق سے اپنے — خاتمِ دل پہ نقش بٹھلایا
جی اٹھا جس سے چار باتیں کیں — رنگِ اعجازِ تازہ دکھلایا
جھک گئے میکشانِ بزمِ سوال — جامِ جود و کرم جو چھلکایا
سنئے سر سے جواں ہوا اقبال — نخلِ دولت مراد پر آیا
ہے یہ سرتاج تاجداروں کا — اس پہ اللہ کا رہے سایا
واقعی ہے اسیرؔ سالِ جلوس — دورِ دورِ فلاحِ خَلق آیا

۱۲۸۱ ہجری

نواب کلب علیخاں بہادر کی مسند آرائی اور ملکہ معظمہ کے حضور سے جو خلعت گورنر جنرل کی معرفت آیا اُن دونوں موقعوں پر دو قصیدے حضرت امیرؔ کے قابلِ ملاحظہ ہیں جو مراۃ الغیب میں چھپ گئے ہیں۔

اب یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ نواب کلب علیخاں بہادر نے اپنی ولی عہدی کے زمانے میں مفتی امیر احمد صاحب سے اپنے باورچی کے لئے سفارش کی تھی جس پر عدالت میں

مقدمہ تھا مگر حضرت امیر نے بلحاظ روداد مقدمہ فیصلہ باورچی کے خلاف کیا اور ولی عہد صاحب نے سنا تو فرمایا کہ اچھا دیکھا جائے گا۔

حضرت امیر کو اس بات کا خیال رہا مسند نشینی کے بعد حضرت امیر نے رام پور سے روانگی کی تیاری کی کہ یہاں قیام مناسب نہیں ہے۔ اسکی خبر کسی طرح نواب کلب علیخاں کو ہوگئی۔ حضرت امیر کو بعد مغرب بلاکر فرمایا کہ میں نے سنا ہے آپ یہاں سے جا رہے ہیں اس کا کیا سبب ہے حضرت نے عرض کیا " مجھے حضور کی ناخوشی کا علم اپنی نسبت ہے " نواب صاحب نے فرمایا " واقعی اُس وقت مجھ کو ناخوشی ہوئی تھی مگر اب آپ کی اُس کارروائی کا مجھ سے زیادہ کوئی قدرشناس نہیں ہے۔ جب آپ نے میرا اثر نہ مانا تو امید ہے کہ آپ انصاف کے جاری کرنے میں کسی کا لحاظ نہ کریں گے اطمینان سے یہاں رہیئے " حضرت امیر نے ارادہ فسخ کر دیا اور سمجھ گئے کہ نواب کلب علی خان اعلیٰ مراتب صوری و معنوی حاصل کرنے والے ہیں۔

ولی عہدی کے زمانہ سے نواب صاحب کو شعر و سخن سے رغبت تھی اب آزادی ملی تو اسطرف انہماک بڑھ گیا۔

دلی اور لکھنؤ کے اہل کمال کو بلا کر اپنی مصاحب منزل کی رونق بڑھائی لکھنؤ اور دہلی کی سلطنتوں کا خاتمہ ہو ہی چکا تھا اور اہل کمال کی صورت حال گویا تھی ؎

یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے ۔۔۔ اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

اسیر۔ امیر۔ جلال۔ بحر۔ عروج۔ قلق۔ تسلیم۔ زکی۔ شرف۔ جان صاحب شعرائے لکھنؤ اور حیا و داغ دہلوی کا مجمع رامپور میں ایک عالم پیدا کر رہا تھا جسکی نظیر اُس وقت کہیں نہیں ملتی تھی یہ صحبتیں رام پور کے فرماں فرما کو اپنے وقت کا مامون الرشید بنائے ہوئے تہیں۔

نواب صاحب نے حضرت امیرؔ کو اپنی اُستادی کے لیے منتخب فرمایا۔
شعر و سخن کی شمع روشن ہو گئی اور انجمنِ ادب میں گلفشانی اس طرح شروع ہوئی
کہ نواب صاحب نظم و نسق ملکی میں جس طرح نئے نئے قانون اور ضابطے جاری کرتے تھے
اسی طرح قلم و سخن میں بھی سکہ جاری کر دیا۔ اب حضرتِ امیرؔ کو مسندِ افتا کا سنبھالنا
دشوار ہو گیا۔ حکمرانوں کی شاعری لڑکوں کی شاعری نہیں ہوتی آخر نواب صاحب سمجھ گئے
کہ امیرؔ جس ذمہ داری سے عدالت کی مسند پر کام کرتے ہیں اب وہ ناممکن ہے۔ آپ کو
عہدۂ مفتی سے سبکدوش فرما کر آپ کے بڑے بھائی مفتی طالب حسن صاحب کو مفتی عدالت
کر دیا سب سے زیادہ خدمت خاص شعر و سخن کی تھی اور اس کے ساتھ حضرت امیرؔ ہی سے
وہ اہم خدمت بھی متعلق تھی جو ایک فارن سکریٹری اور پرائیویٹ سکریٹری انجام دیا کرتا ہے
غدر کے کرشمے تمام ہندوستان میں نظر آتے تھے۔ رامپور بھی مستثنیٰ نہ تھا مگر خدا کی مہربانی
شاملِ حال تھی کہ جو خط و کتابت برٹش گورنمنٹ اور دربارِ رامپور میں ہوتی تھی وہ دونوں
میں مضبوطئ اتحاد اور استحکام کا سبب ہوتی گئی۔

نواب کلب علی خان بہادر کا ذوق و شوق سخن نواب یوسف علی خان بہادر سے
بھی بڑھا ہوا تھا اور باوجود کثرتِ مشاغل ملکی و انتظاماتِ ریاست وہ شاعری
کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ روزانہ شعر کہتے تھے اور اصلاح لیتے تھے۔ اکثر
رات کو بارہ بجے اور ایک بجے تک جستہ جستہ اُن کا کلام امیرؔ کے پاس آتا تھا
اور اسی وقت اصلاح کے بعد واپس ہوتا تھا۔ اس محنت اور متفرق طور پر اصلاح
کو دیکھ کر حضرت امیرؔ فرماتے تھے کہ امیرؔ نواب کی استادی درحقیقت نہیں ہے

رازداری کے امور کی انجام دہی کے واسطے ایک خاص وقت مقرر تھا اُسوقت نواب اور امیر کے سوا دوسرا کوئی موجود نہ رہتا تھا اور دوسری ملاقات عام دربار میں ہوتی تھی۔

نواب اُن کی رایوں اور رازداری سے بنہایت درجہ محظوظ اور مطمئن تھے۔

دربار نواب کلب علیخاں بہادر

مصاحب منزل آراستہ ہے۔ فرش تکلف بچھا ہے اور اُس پر وہ لوگ رونق افروز ہیں جو انتخاب روزگار سمجھے جاتے ہیں اور فی الواقع ہیں۔ ایک جانب فضلا اور حکماے عصر کی نشست ہے ایک طرف شعراے نامدار کی جماعت بیٹھی ہے آپس میں مزے مزے کی مکالمت ہو رہی ہے خصوصاً علمی تذکرہ وہ لطف دیرہا ہے کہ روح کو بالیدگی ہوتی ہے اور دل تر و تازہ ہوتا ہے کبھی شاعری چھڑ جاتی ہے۔ اشعار آبدار پڑھے جاتے ہیں کبھی مسائل علمی و ادبی پر بحث ہوتی ہے۔ الفاظ و محاورات کی تنقید ہوتی ہے غرض یہ وہ پاکیزہ صحبت ہے جو بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ نواب نامدار کلب علیخاں بہادر جو ان باکمالوں کے جامع ہیں ایوان خاص میں تشریف رکھتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد ایک چوبدار مصاحب منزل میں داخل ہوتا ہے اور وہ یہ الفاظ زبان پر لاتا ہے "سرکار یاد فرماتے ہیں" اس کے سنتے ہی وہ مجمع مصاحب منزل سے اٹھ کر ایوان خاص میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں نواب صاحب جلوہ فرما ہیں۔ ہر روز صبح ہوتے ہی مصاحب منزل میں اہل دربار آجاتے تھے وہاں بیٹھ کے نواب صاحب کے

یادفرمانیکا انتظار کرتے اورعلمی مباحث میں وقت گزارتے تھے۔ نواب صاحب ضروریات سے فارغ ہوکران سب کو اپنے سامنے طلب کرتے تھے اور دیر تک دربار گرم رہتا تھا۔ اُس دربار میں بھی یہی مباحث اور یہی مشاغل رہتے تھے تحقیق لغات اور تنقید زبان کا بھی نواب صاحب کو بہت شوق تھا۔ اکثر نواب صاحب اپنا کلام حضار دربار کو سنانے کا حکم دیتے تھے اور ان کا کلام امیر پڑھا کرتے تھے۔

مشاعرۂ رامپور

اس زمانے میں مشاعرے نہایت سرگرمی اور اہتمام سے ہوتے تھے۔ ہندوستان کے تمام مشہور اور مستند شعرا کی موجودگی نے عام طبایع میں شاعری کا اثر پیدا کردیا تھا۔ شہر میں یوں تو اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے مگر ایک مشاعرہ خاص صاحبزادہ مہدی علیخاں کے یہاں مسلسل ہوتا تھا۔ یہ مشاعرہ سرکاری کہا جاتا تھا جو خاص امیر کی نگرانی میں منعقد کیا جاتا تھا۔ تمام دیگر مشاعروں سے یہ مشاعرہ اس بات میں امتیاز رکھتا تھا کہ اس کے سامعین میں علما اور فضلا اور صلحا بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی حضرت شاہ محمد معصوم صاحب نقشبندی اور اسی طرح دیگر حضرات اکثر شامل ہوا کرتے تھے۔

ان مشاعروں میں حضرت امیر بھی جب وہ رامپور میں ہوتے تو شریک ہوتے اور صدر مشاعرہ وہی ہوتے تھے کیونکہ شعرا میں ہر اعتبار سے امیر کا مرتبہ سب سے اعلیٰ تھا اور نواب کلب علیخاں بہادر کے استاد الاستاد تھے سب کے آخر میں غزل

پڑھتے تھے اور انہیں کی غزل پر مشاعرے کا خاتمہ ہوتا تھا۔
اکثر مشاعروں میں ردیف وارطرح ہوتی تھی اور کبھی یہ التزام نہیں بھی ہوتا تھا۔ نواب صاحب کی غزل بھی مشاعرے میں آتی تھی اور امیر ہی پڑھتے تھے۔ مشاعرے کے بعد نواب صاحب موصوف امیر کی غزل طلب فرماتے تھے خود دیکھکر لطف اٹھاتے تھے اور پڑھکر حاضرین دربار کو سنایا کرتے تھے چنانچہ امیر کی یہ غزل جو مشاعرے میں پڑھی جاچکی تھی۔

جس غنچہ لب کو چھیڑ دیا خندہ زن ہوا
جس گل پہ ہم نے رنگ جمایا چمن ہوا

نواب ممدوح نے طلب کر کے ملاحظہ کی تو استاد سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے اس غزل کے کہنے میں آپ کا جی نہیں لگا حضرت امیر کو خیال ہوا کہ نواب صاحب کو غزل پسند نہیں آئی۔ امیر نے پھر فکر کی اور دوسرے وقت دوسری غزل پیش کی۔ نواب صاحب نے دیکھا اور کہا کہ آپ نے یہ غزل بھی توجہ سے نہیں کہی۔ اس پر امیر نے تیسری غزل تیسری دفعہ پیش کی۔ نواب صاحب نے تیسری غزل دیکھکر فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین ہی اچھی نہیں ہے اس پر امیر کو پھر وہی خیال ہوا اور پھر فکر کر کے چوتھی غزل چوتھی بار پیش کی یعنی چار غزلیں کہیں۔ پھر تو نواب صاحب سے رہا نہ گیا بے اختیار ہو کر فرمایا کہ میں نے محض آپ کی فکر کا اندازہ کرنے کے لئے ایسا کہا تھا۔ پہلی غزل دیکھکر مجھے خیال ہوا کہ اب اسمیں گنجایش نہیں ہے مگر آپ ہی کو خدا نے یہ قدرت عطا فرمائی ہے کہ اس زمین میں متواتر چار غزلیں ایک سے ایک بڑھکر کہیں "میرے خیال میں نواب صاحب نے جلدی کی کہ چار ہی غزل پر اپنا منشا

ظاہر کر دیا اگر زیادہ دیر تک یہ سلسلہ قایم رکھتے تو البتہ امیر کی قوتِ فکریہ کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ۔ ان غزلوں کے مطالع حسب ذیل ہیں ۔

یہ رفتہ رفتہ ضعف سے احوالِ تن ہوا — سائے کی بھی نگاہ سے غائب بدن ہوا

جس غنچہ لب کو چھیڑ دیا خندہ زن ہوا — جس گل پہ ہم نے رنگ جمایا چمن ہوا

اگلے کس طرح نسبت بتدریج تن ہوا — تن پیرہن تو پیرہن اپنا کفن ہوا

وہ مست ہوں کہ شیشے تب کفن ہوا — جیب رہن مے فروش کے گھر پیرہن ہوا

چھیڑا جو میں نے یار کو گرمِ سخن ہوا — پیدا مری زبان سے اس کا دہن ہوا

ظالم بدل کے بھیس سوا راہزن ہوا — پتھر بنا جو شیشہ تو توبہ شکن ہوا

سو رنگ سے میں مستِ بہارِ چمن ہوا — جو گل نیا تھا جامِ شرابِ کہن ہوا

باہم جو ذکرِ زلفِ شکن در شکن ہوا — برہم تمام سلسلۂ انجمن ہوا

مرکز علو سے قدر سے عریاں بدن ہوا — حوروں میں قدسیوں میں تھا کفن ہوا

دل عشق میں یہ جاذبِ رنج و محن ہوا — مانندِ داغ درد بھی جزوِ بدن ہوا

کس کا رخِ صبیح پہ پرتو فگن ہوا — آئینہ دار مالکِ نہرِ بن ہوا

مشاعرۂ لکھنؤ

سنہ ۱۳۱ھ میں حضرت امیر لکھنؤ گئے ہوئے تھے ۔ حضرت اسیر کی رحلت کو تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا فرزندانِ حضرت اسیر مرحوم ہمعصر شعرائے لکھنؤ میں

ممتاز تھے جنکی نسبت حضرت امیر نے فرمایا ہے۔

خدا رکھے کیا ہے نام کیا استاد کا روشن
امیر استاد زادوں پر ہم اپنے فخر کرتے ہیں

حضرت امیر کے ورود سے شعرائے لکھنؤ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مدت کے بعد انکا یہاں آنا ہوا ہے اس موقع پر ایک مشاعرہ کیا جائے چنانچہ یہ طرح دیگئی۔

جادو بھرا ہوا ہے کسی کی نگاہ میں

اس مشاعرے کی اطلاع دینے جناب حکیم و جناب افضل حضرت امیر کے پاس اسوقت آئے جبکہ مشاعرے میں بہت کم وقت رہگیا تھا۔ حضرت امیر نے کمی وقت اور ناسازیِ مزاج کا عذر کیا تو کہا گیا کہ آپکو فکر کی ضرورت نہیں ہے اس زمین میں آپ کی تین غزلیں چھپی ہوئی مراۃ الغیب میں موجود ہیں چند شعر اُس میں سے آپ پڑھ دیں تو مشاعرے کی عزت افزائی ہوگی۔ یہ سنکر حضرت امیر رضامند ہوگئے مگر شاگردانِ امیر نے اطلاع پاکر اصرار کیا کہ اگر حضرت مشاعرے میں شرکت فرمائیں تو نئی غزل ہونی چاہئے۔

غرض حضرت نے تھوڑے وقت میں صرف ایکدن باقی رہگیا تھا فکر کی اور نئی دو غزلیں لکھکر اس وعدے کے ساتھ مشاعرے میں شرکت فرمائی کہ میں بوجہ نادرستی مزاج مشاعرہ ختم ہونے کا انتظار نہ کرسکونگا۔ امیر کی وجہ سے مجمع بہت بڑھگیا تھا۔ یہ مشاعرہ لکھنؤ میں ایک یادگار مشاعرہ تھا پھر ایسا مشاعرہ کوئی نہیں ہوا جس میں وہ صورتیں نظر آتیں جو چالیس برس پہلے موجود تھیں۔

بعض لوگوں کو یہ گمان تھا کہ امیر اپنی پرانی غزل پڑھینگے مگر جب شمع حضرت کے

سامنے آئی اور حضرت نے غزل تازہ کا یہ مطلع پڑھا ؎

اس شان سے ہم آئے تری جلوہ گاہ میں
مشعل دکھائی برقِ تجلّی نے راہ میں

لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور مشاعرے کا رنگ بدل گیا۔ ایک ایک شعر نے بجلی کا کام کیا۔ حضرت کے بعد کسی شاعر کو غزل پڑھنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ کئی شاعروں نے اپنی اپنی غزلیں چاک کرکے شمع کے نذر کردیں کہ اب غزل پڑھنا بیکار ہے اور اسی وجہ سے مشاعرے میں تھوڑی دیر تک سکوت رہا کچھ وقفہ کے بعد مشاعرے کا سلسلہ پھر شروع ہوا اور یہ مشاعرہ دوسرے دن ختم ہوا۔

منشی عبدالرحمن صاحب بسمل کا بیان ہے کہ حضرت امیر ہنوز مشاعرے میں تھے کہ ان کے اشعار مشاعرے سے باہر نکل گئے اور لوگوں کی زبانوں پر دور تک پہونچے یہانتک کہ میں نے چوک میں لوگوں کو حضرت کے شعر پڑھتے اپنے کانوں سے سنا۔

استاد کی عظمت

حضرت اسیر نے امیر کے کلام پر ڈیڑھ دو برس سے زیادہ اصلاح نہیں دی مگر امیر کی سعادت و عقیدت کا یہ حال تھا کہ جب تک جناب اسیر زندہ رہے حتی الوسع کلام دکھاتے رہے چاہے اصلاح ہو یا نہو۔ جس وقت جناب اسیر کو انتقال ہوا حضرت امیر کے رنج و تعب کی انتہا نہ تھی اسی پریشانی میں

قطعۂ تاریخ تصنیف فرما کر دل کی کلفت نکالی جس کے ہر شعر سے جذباتِ دلی کا اظہار ہوتا ہے ۔

افسوس کہ از گردشِ این چرخِ کہن — حاصل ز حیات نیست جز رنج و محن
نازادہ کس از مادرِ ایام کہ مرگ — آمادہ نکرد بہرِ او گور و کفن
نا آمدہ کس ز نیستی در ہستی — کو را ننمودند نخستین مدفن
نشگفت گلے بہ فردوس اندر باغ — کافسردہ و پژمردہ نشد در بہمن
خوش بود زمانِ گل و ایامِ بہار — گر بادِ خزاں نیامدے در گلشن
این طرفہ کہ چوں خزاں آید در باغ — اول فگند بخاک سوری و سمن
نازادہ کس از خاک کہ گلشن نگرفت — از کینہ در آغوش و نفشردش تن
گر چرخ بخاکیاں شود دشمن خاک — نو بادۂ خویش را چرا شد دشمن
خوں ریز تر از چرخ نباشد جلاد — خونخوار تر از خاک نباشد رہزن
ہر روز غمے زاید و ہر شب المے — تا مادرِ ایام بود در زادن
ہر شام چو ہمرنگ شدہ سر ز جیبِ افق — ہر صبح کشد چو رونما از شب دامن
ہر دم ستمے تازہ نہد سپہرِ نجوم — طرحِ ستمے نو فگند چرخِ کہن
ماتمکدہ است سطحِ این خاک دژم — کز سوگِ بزرگاں ہمہ اند شیون
فارغ نبود ہیچ دل از سوگِ جہاں — خاصہ دلِ من ز سوگِ آن فخرِ زمن
شاہنشہِ اقلیمِ معانی کہ بیاں — قاصر بود از وصفِ کمالش چو من
تا میر مظفر علی از این جہان کاہ — بربستہ سبک رخت و گراں گشت حزن
از اوج گرفت و فضل و دانش پستی — او زندۂ جاوید شد و مرد سخن

استادِ جہاں بود بشاگردیِ او — زیباست اگر فخر کنند اہلِ زمن
جز راہ بحق نداشت پیدا و نہاں — جز روئے باو نداشت در سرّ و علن
از بعد ہزار و اند زیں سال کہے — از نسلِ علی آمدہ باخلقِ حسن
عمرے باید بلے بلائے زجنبش — پیدا شود او ویسؓ آید بقرن
تا زیست چناں زیست کہ می باید زیست — چوں رفت چناں رفت کہ باید رفتن
چوں دید دریں جہاں غریب است ورا — باشد وطن دیگر و دیگر مامن
بگذاشت ہم ابہ غربت اندر بے یار — خود یک تنہ راند و کرد رو سوئے وطن
او رخت بروں برد ازیں دارِ فنا — من در غمِ او چاک زدم پیراہن
گفتم پئے تاریخِ وفاتش گویم — یک مصرعِ موزوں کہ دہد بو سخن
دیدم بفغاں و نالہ بگفت امیر — سلطانِ سخن امامِ فن قبلۂ من

۱۲۹۹ھ

نواب کلب علیخاں کی رحلت

نواب صاحب کی امارت و قیادت اور سیاست کی بہت شہرت تھی اور رامپور مجموعہ تھا ایسے اصحاب کا جن کی قابلیت اور علمیت اپنی اپنی جگہ خاص طور پر بہت زیادہ شہرت رکھتی تھی باوجود فارغ البالی اور اطمینان کامل کے نواب صاحب کی صحت اچھی نہ تھی اور یہ اُن کی کمال خوش نصیبی تھی کہ باوجود خرابی صحت مکہ معظمہ کو تشریف لیگئے اور حج و زیارت سے مشرف ہوئے۔ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک خیر و خیرات بیں

اسقدر روپیہ صرف فرمایا کہ آج تک وہاں کے لوگ اُن کو یاد کرتے ہیں۔

نواب صاحب کی رحلت ۲۷ رجمادی الثانی ۱۳۱۲ھ روز چہارشنبہ کو ہوئی اور وہ جیسے نیک اور کامل الاوصاف تھے خدا نے ویسا ہی انجام کیا یعنے نزع میں دم آخر تک اسم ذات کا ورد جاری تھا۔ رامپور کیا ہندوستان سے عرب تک ان کی موت کا رنج و الم سب کو ہوا ظاہر ہے کہ حضرت امیر سے زیادہ کس پر اس سانحہ ہوش رُبا کا اثر ہوا ہوگا۔ حضرت امیر نے جو قطعۂ تاریخ اس حادثۂ جانفرسا پر لکھا ہے اُس کے ہر شعر سے ان کے دلی کیفیات ظاہر ہوتے ہیں۔ اسکو پڑھکر اب بھی پڑھنے والوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری ہو جاتا ہے۔ اب وہ نواب خلد آشیاں کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

نواب صاحب کی وفات کی تاریخ جن جذبات اور درد دل کے زیر اثر حضرت نے کہی ہے اُس کو پڑھکر کوئی سنگدل بھی آنسوں کی چادر قبر پر چڑھائے بغیر نہیں رہسکتا۔ قبر گو رامپور میں ہے مگر جس جگہ کوئی ہوگا اس تاریخ کو پڑھکر روئیگا۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ یہ شعر دل سے نکلے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ امیر سے زیادہ دوسرے پر اس حادثے کا اثر کسی طرح نہیں ہو سکتا تھا۔

قطعۂ تاریخ وفات نواب خلد آشیاں

الاماں از برق تازیہائے چرخ چنبریں — الحفیظ از فتنہ سازیہائے ایں آفت کمیں

جائے عبرت باشد ایں آشوب گاہ پُرفتن — چشم بکشا و دمے نیرنگ دنیا را ببیں

کآفتابِ آسمانِ شوکت و جاه و جلال　　ماهِ چرخِ دولت و اقبال و فیض و داد و دین

فخرِ اربابِ سلف سرمایهٔ نازِ خلف　　افتخارِ اولین و اعتبارِ آخرین

حق پرست و حق پذیر و حق پژوه و حق شنو　　حق شناس و حق پسند و حق گذار و حق گزین

شاغلِ فکر و نماز و عاملِ حج و زکوٰة　　پیروِ شرعِ حبیبِ خاصِ ربُّ العالمین

خوش مذاق و خوش بیان و خوش خصال و خوش چال　　خوش خط و خوشگوی و خوش گفتار و خوش رو و جبین

وارثِ بی وارثان و چارهٔ بیچارگان　　میهمان پرور مسافر دوست غمخوارِ حزین

از درِ فیضش اعالی چون اداني بهره یاب　　اغنیا از خرمنش همچون گدایان خوشه چین

دوست دشمن هر دو منقاد و مطیعِ حکمِ او　　زانکه رایاتش مظفر بود و آیاتش مبین

پیشِ قدرش آسمان اندوخته رفعت ز خاک　　با وقارش کوه تمکین ساخته بند زمین

چون نشستی بر سرِ تخت از پئی جود و نوال　　جم بُدی بر آستان دیهیم بُدی در آستین

شیر دل کلبِ علی خان بهادر نامور　　مالکِ طبل و علم رونق دهِ تاج و نگین

آنکه با یک کاروان از تابعانِ خویش گشت　　زائرِ بیت الحرام و روضهٔ سلطانِ دین

آنکه اندر عهدِ او شد رامپور آرامپور　　مصطفیٰ آباد شد در دورِ او این سرزمین

در هزار و دو صد و پنجاه پیدا گشته شد　　در هزار و دو صد و هشتاد و یک مسند نشین

در هزار و سه صد و چار از جمادی الآخره　　بیست و هفتم چارشنبه بود و ساعت چارمین

ناگهان زد کوسِ رحلت سوی دارِ آخرت　　ذوقِ دین پیداشت از دنیا برافشاند آستین

چشمِ حق بینش نیفگند نظر جز سوی حق　　حق چو او شاغل با همنشین دنیا چنین

خواند در پیشِ خودش تا سورِ رحمت کند　　حق پرستی روحِ او را برد تا عرشِ برین

تیره تر شد از فراقش روزِ روشن همچو شب　　شد سیه پوش از دو عکسش هر کهین و مهین

مہر و مہ بے نور گشتہ جہاں و لہا بے سرور | آسماں شد پر غبار و خاک بر سر زد زمیں

رفتہ رفتہ تا حرم چوں رفت ازیں ماتم خبر | در حریم مہر وے چوں محرماں غم شد مکیں

ولے قسمت ناز بر دارم ز دنیا رفت من | زندہ ام اندر صف ماتم ز سر تا پا غمیں

بد ترم از مردگاں اما نمی میرم ازاں | رہ نمی یابد اجل سوے من اندوہگیں

ہر نفس در سینہ از پژمردگیہائے دلم | می کشد تصویر حسرت چوں نگاہ واپسیں

عہد پیری راحت افزوں خواہد و راحت کجا | میکند راحت رساں آرام در زیر زمیں

تا بہ کے افسانۂ ایں درد نالیہا امیر | تا کجا اظہار سوز دل بہ آہ آتشیں

دست زن در دامن رحمت با خلاص نیاز | تا دہد جائے بر زگش حق بفردوس بریں

وز پئے سال وفات آں شہ خلد آشیاں | محو دیدار جمال رحمۃ للعالمین

نقش کن از خامۂ حسرت بہ لوح مزار | خوابگاہ حامی اسلام امیر المومنین

١٣٠٤ھ

نواب مشتاق علیخاں بہادر

گورنمنٹ ہند کی طرف سے مسٹر کولنگ کمشنر روہیلکھنڈ و پولیٹیکل ایجنٹ ریاست نے ٢٥ مارچ کو یہ اعلان کیا کہ ٢٤ مارچ کو نواب کلب علیخاں نے وفات پائی ان کی جگہ ان کے صاحبزادہ ولیعہد نواب مشتاق علی خاں کو گورنمنٹ ہند نے ریاست رامپور کا مالک اور رئیس تسلیم کیا ہے۔ جنرل اعظم الدین خاں نے ایک تقریر حسن انتظام برقرار رکھنے پر کی اور نظم و نثر میں تہنیت نامے پیش کیے گئے۔

حضرت امیر نے مسند نشینی کے موقع پر جو قصیدہ پڑھا وہ قابل دید ہے۔ قصائد یہ

اُسکو دیکھیے گا۔

افسوس کہ نواب مشتاق علیخاں عوارض صعب کی وجہ سے دو سال تین مہینے حکمرانی فرماکر ۲۵ر فبروری ۱۸۸۷ء دوشنبہ کے دن ظہر کے وقت رحلت فرما گئے۔ آپ کا لقب بعد وفات نواب عرش آشیاں ہوا۔

حضرت امیرؔ نے ذیل کی تاریخ جس درد اور جوش میں لکھی ہے اس کو ایک سخنور ایسا قلم ہی لکھ سکتا تھا۔

قطعۂ تاریخ رحلت نواب عرش آشیاں

دنیا ہے عجب مقام عبرت — یہ حسرت و یاس کا مکاں ہے
اس گھر میں کہاں ثبات کو دخل — اس گھر میں جو ہے وہ میہماں ہے
اس گھر میں ہے ایک شب بسیرا — آیا ہے جو آج کل رواں ہے
دروازے ہیں حسرتوں کی بیٹھک — دیواروں سے بیکسی عیاں ہے
ہو اہل زمیں کو خاک راحت — گردش میں ہمیشہ آسماں ہے
فانی ہے یہاں کا عیش و آرام — ہے آج بہار کل خزاں ہے
دیکھو کہ جمادی الآخرہ کی — چوبیسویں کی یہ داستاں ہے
نواب وہ جن کا نام نامی — مشتاق علی کے ساتھ خاں ہے
رحلت فرما ہوئے جہاں سے — بسمل اس غم سے اک جہاں ہے
ہے رنگ جو آسماں کا نیلا — آہوں کا گھٹا ہوا دھواں ہے
مانند زمیں ہے خاک بر سر — اس درجہ مکدر آسماں ہے

ہے ماتمیوں کا دردِ دل ... وہ
جس پر کہ سحاب کا گماں ہے

بتیس برس کی عمر پائی
مرجانے کی عمر یہ کہاں ہے

انصاف و سخا و خلق سب کا
شاہد ہر پیر و ہر جواں ہے

احساں جو کئے ہیں حد سے باہر
باہر امکاں سے بیاں ہے

احسان کا بندہ ہے ہر انساں
تعریف سے خلق تر زباں ہے

جاتا ہے سلوک رایگاں کب
اب ساتھ وہ جود و امتناں ہے

صبر آئے اسیرِ دل کو کیونکر
یہ ماتمِ مرگِ نوجواں ہے

اس غم میں چلا میں سوئے صحرا
جو خاص مقامِ وحشیاں ہے

ہر دم تھا یہی مری زباں پر
آقا مرے ہائے تو کہاں ہے

عبرت ہوئی راہبر ادھر کو
حسرت کا خاص جو مکاں ہے

دکھلا کے بہت سی کہنہ قبریں
بولی یہ نشانِ رفتگاں ہے

ہیں ملکِ عدم کے سب مسافر
ہے پیر کوئی کوئی جواں ہے

شیخ ان میں سے ہے کوئی کوئی سید
کوئی ہے مغل تو کوئی خاں ہے

دارا و سکندر و فریدوں
سب مرنوں کا یہی نشاں ہے

پوچھ ان سے کہاں وہ شان و شوکت
پوچھ ان سے کہاں وہ عز و شاں ہے

پوچھ ان سے کہاں ہے وہ چھپر کھٹ
پوچھ ان سے کہاں وہ سائباں ہے

کیوں دھوپ میں خاک پر پڑے ہیں
ہے چتر نہ تخت کا نشاں ہے

یہ دیکھ کے چیخ اٹھا میں بے تاب
ہے ہے یہ عدم کا کارواں ہے

پھرتا تھا ادھر ادھر تڑپتا
کہتا ہوا ہائے وہ کہاں ہے

میں جس کی تلاش میں ہوں برباد	جس کے لئے دل مرا تپاں ہے
آیا نظر اک زمیں کا تختہ	سمجھا میں کہ تختۂ جناں ہے
فردوس کے پھول ہیں سرِ قبر	ابرِ رحمت کا سائباں ہے
دولہا سا بنا ہے کوئی لیٹا	تربت پر سیج کا سماں ہے
دوڑا لیے فاتحہ سوئے قبر	سمجھا کہ یہی وہ آستاں ہے
آئی یہ ندا ادب سے آنا	یہ مرقدِ عرش آشیاں ہے

۱۳۰۶ھ

نواب حامد علیخاں بہادر

آپ کی ولادت باسعادت ۲۹ رجب ۱۲۹۲ھ مطابق ۳۱ اگست ۱۸۷۵ء کو ہوئی اور مسند نشین ریاست ۲۹ جمادی الثانی ۱۳۰۶ھ ۲۷ فروری ۱۸۸۹ء کو ہوئے اور مسٹر نیل ایجنٹ ریاست نے منجانب گورنمنٹ دربار کرکے آپ کو تخت نشین کیا۔ نواب صاحب نے مسٹر نیل کے جواب میں فرمایا کہ خدا نے چاہا تو اسی طرح عمل درآمد ہوگا جس طرح میرے آبا و اجداد اس بارِ عظیم کو اٹھاتے رہے ہیں۔ حضرت امیر نے نواب صاحب کی خدمت میں یہ قطعۂ تاریخِ مسند آرائی پیش کیا۔

قطعۂ تاریخِ جلوس

بارک اللہ جلوہ گر شد بر سریر سروری	نامور حامد علیخاں سروری را مستحق

آنکہ باشد حق پرست و حق پسند و حق پژوہ — آنکہ باشد حق شناسِ قدرِ یاراں راحق
فیض باشد از کتابِ خلقِ او یک صفحہ — خلق از مجموعۂ اوصافِ ذاتش یک ورق
ابرِ جودش گر نبارد بر سرِ کشتِ امل — تخم ہر امید را باشد چو گندم سینہ شق
غازہ مالد در طرب گاہش فلک بر روئے خویش — مردم از ناآگہی خوانندش از نامِ شفق
گر بہ پروانہ را سوزد شبے در بزمِ او — داغ گردد شمع و سرتا پا شود غرقِ عرق
پیشِ دستِ ہمتش آساں شود ہر مشکلے — ناخنِ فکرش کند حل ہر معمائے ادق
درمیانِ گرز ہائے گاؤ سر خصمش بود — صورتِ لامیکہ باشد در دوائر قافِ قلق
ملک و دولت یافت از تارِ نگاہِ لطفِ او — رشتۂ شیرازۂ بہر دفترِ نظم و نسق

سالِ ہجری و مسیحی زد رقم کلکِ امیر
گوہرِ تاجِ ریاست ۔ ابرِ رحمت ظلِ حق
۱۸۸۹ء
۱۳۰۶ھ

علاوہ اس قطعہ تاریخ کے حضرت امیر نے تہنیت مسند نشینی میں ایک زبردست قصیدہ بھی کہکر پیش کیا جسکی تشبیب میں بہار و خزاں کا قابل دید معرکہ ہے وہ قصیدہ حصۂ دوم میں ناظرین کے ملاحظہ سے گزریگا ۔

اس عہد میں اب تک بہ فضل خدا حضرت امیر کا خاندان رامپور میں زیر سایہ نواب صاحب دعاگوئی میں مصروف ہے اور حضرت کے بڑے صاحبزادے جناب مولوی محمد احمد صاحب صریر مینائی حق نمک وفاداری و خیر خواہی اسی طرح ادا کر رہے ہیں جس طرح ان کے والد مرحوم حضرت امیر ادا کرتے تھے اور نواب صاحب کو اسقدر بھروسہ ان کی ذات ستودہ صفات پر ہے کہ شاید کسی امر پر ہوا اپنا استادِ فنِ شعر بھی ان کو کیا ہے اور حضرت امیر کے رنگ سخن کی اکثر تعریف فرمایا کرتے ہیں ۔

حضرت امیر نے جو قصائد مسند نشینی اور جشن میں کہے ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ریاست کے ساتھ حضرت کے خیالاتِ وفادارانہ کیا تھے۔

سفرِ بھوپال

امیر کی شہرتِ کمال نے تمام ملک سے اون کو روشناس کر دیا تھا حتّٰی کہ بیشتر روسائے ہند بھی انکی اعلی شخصیت سے بخوبی واقف تھے اور جس رئیس کو شعر و سخن کی لذّت تھی اُسکا میلانِ خاطر امیر کی جانب تھا۔

نواب شاہجہاں بیگم والیۂ ریاست بھوپال نور اللہ مرقدہا شاعرہ بھی تھیں تاجور تخلص تھا انکی صحبت میں امیرؔ کا ذکر اکثر آیا کرتا تھا جسوقت اُنھوں نے اپنا دیوان مطبع مفید عام آگرہ میں چھپوایا ہے اسکا ایک نُسخہ تحفتہً امیر کو بھی بھیجا حضرت امیر نے اُسکا شکریہ ادا کیا۔ امیر اللغات کی دونوں مطبوعہ جلدیں بتوسط منشی امتیاز علی صاحب وزیرِ بھوپال سرکارِ عالیہ کی خدمت میں گزرانی گئیں اُنھوں نے اس عظیم الشان تالیف کو بنظرِ قدردانی ملاحظہ فرمایا۔ اس سلسلہ میں رسمِ خط وکتابت جاری رہی۔

حضرت امیر کے بھانجے شیخ حافظ علی عذر کے بعد بھوپال چلے گئے تھے اور پھر پلٹ کر وطن نہیں آئے یہ امیر کی بڑی بہن کے فرزند اور اُنکے تقریباً ہمسن تھے اُنسے ملنے کا خیال حضرت امیر کو مدت دراز سے تھا۔

اتفاق سے ۱۸۹۷ء میں حضرت امیر نواب سید بنیاد حسین خاں جاہ کے

اصرار پر کانپور تشریف لیگئے جو حضرت امیر کے عمدہ تلامذہ میں ہیں۔
اُستاد کی تواضع و تکریم میں نواب صاحب موصوف نے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔
چار پانچ روز وہاں قیام فرماکے بعض اعزہ کی رائے سے حضرت نے سرکار عالیہ کو تار دیا کہ میں بھوپال کا قصد رکھتا ہوں سرکار عالیہ نے اسپر اظہار مسرت فرمایا۔
اور اُنکے قیام کے لیئے باغ فرحت افزا تجویز کیا گیا۔ جسوقت حضرت کی گاڑی بھوپال کے اسٹیشن پر پہونچی ہے سرکاری گاڑیاں اور ارکان دولت پیشوائی کے لیئے وہاں موجود تھے۔ اور حضرت کے اعزا و احبا و شعرا کا بھی ہجوم تھا۔ اعزاز کے ساتھ فرحت افزا میں مہمان سرکار کیئے گئے۔ سرکار عالیہ کی طرف سے روزانہ جو مدارات تھی وہ بہت ہی قابل قدر اور پُرشان و شکوہ تھی۔ زیادہ دن تک قیام رہا اور ایک ملاقات سرکار عالیہ سے لطف کے ساتھ ہوئی۔

سرکار عالیہ نے عبدالجبار خاں بہادر سی۔ آئی۔ ای۔ وزیر ریاست کو ایما فرمایا کہ امیر مینائی ہمارے مہمان ہیں آپ اُن سے ملئے۔ چنانچہ وزیر صاحب موصوف فرحت افزا میں آکر ملے جو علاوہ اور قابلیتوں کے بہت باخدا بزرگ تھے۔ حضرت امیر سے ملکر انکے گرویدہ ہوئے۔ بار بار ملاقات ہوتی رہی۔

عید اضحیٰ کا موقع آگیا۔ امیر صاحب نے مسجد فرحت افزا میں دوگانہ عید ادا کیا۔ وہاں شعر کہنے کا بھی سلسلہ رہا بعض مواقع پر کچھ اشعار بھی ملاحظہ سرکار عالیہ سے گزرانے گئے۔ چنانچہ فرحت افزا میں فروکش ہوتے ہی یہ قطعہ تصنیف فرمایا۔

قطعہ

پا ز سر کردہ بہ طوفِ حرمت آمدہ ام — جاں بکف بہرِ نثارِ قدمت آمدہ ام
من ہم اے ابرِ کرم ہیچو صدف بردرِ تو — بامیدِ رشحاتِ کرمت آمدہ ام

رباعی تہنیت عید اضحیٰ

عیدِ قرباں تھی سال بھر سے بعید — تھی زیست سے قطعاً اُسے قطعِ امید
عیدی اُسے دی گلے لگا کر شہ نے — کہنے لگی عید آج ہوئی میری عید

آم عطا ہونے کا شکریہ

آم آئے ہیں سرکار سے کیا تازہ و تر — ہیں شیرۂ جاں سے بھی حق میں بہتر
ظاہر ہے امیران کی سرسبزی سے — یہ آم ہیں فیضِ عام کے خاص ثمر

شکریہ مہماں نوازی

پامالوں نے کب یہ سرفرازی دیکھی — بیچاروں نے کب یہ چارہ سازی دیکھی
مجھ سے تو ملا کے آنکھ کہدے کوئی — کس آنکھ نے یہ بندہ نوازی دیکھی

رباعی

از سوئے من ست یاس حسرت آگاہ — وز جانبِ تو نویدِ صد عزت و جاہ
من غرقِ ندامتم ز تقصیرِ سپاس — بحرِ کرمت بجوشش سبحان اللہ

باریابی کے موقع کو سرکار عالیہ ٹالتی تھیں اس خیال سے کہ باریاب ہوتے ہی امیر صاحب چلے جائینگے - اس موقع پر آپ نے یہ رباعی کہکر پیش کی -

رباعی

محرومیٔ بخت کی شکایت نہ رہے　　　آئینہ دل میں گردِ کلفت نہ رہے
حاضر ہو سلام کو درِ دولت پر　　　ہے عمر اخیر یہ بھی حسرت نہ رہے

باریابی ہونے پر حضرت امیر نے ایک مسدس تازہ پڑھا اور سرکار عالیہ نے بیحد تعریف فرمائی -

باریابی کے بعد بھی پھر واپسی کی اجازت نہیں ملتی تھی اسکے لئے حضرت امیر نے یہہ رباعی گذرانی - جسکے ملاحظے کے بعد اجازت ملی اور باعزاز رخصت کئے گئے -

رباعی

اس در پہ مسافر جو پہنچ جاتا ہے　　　بھولے سے بھی گھر یاد نہیں آتا ہے
مہمان جو دیکھتا ہے یہ شانِ کرم　　　رخصت کا نام لیتے شرماتا ہے

سفر بنارس

حضرت غفران مکان نظام الملک آصفجاہ سادس نواب میر محبوب علیخاں طاب ثراہ کا تخلص آصف تھا جنہیں شاعری کا خاص ذوق تھا - امیر کے تصانیف مطبوعہ اکثر ملاحظہ فرماتے تھے - سنا گیا کہ داغ جب استادِ حضور ہوے اور خطاب منصب

سرفراز کیے گئے تو اعلیحضرت نے فرمایا کہ کیا امیر اب بھی یہاں نہ آئینگے مصاحبان میں بعض لوگ مثلاً جناب داغ و نواب داور الملک و نواب محبوب یار جنگ بہادر وغیرہ حضرت امیر سے رسم خط و کتابت رکھتے تھے حضرت کے نئے تصانیف جو سرکار میں نہ تھے جناب داغ نے حسب ایما طلب کرکے پیش کیے اور حضرت امیر کو یہ بھی لکھا تھا کہ یہاں میری اور آپ کی غزلیں ملائی جاتی ہیں اور کلتے میں تولی جاتی ہیں خصوصاً یہ غزل ع کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا۔

پورا مطلع حضرت امیر کا یوں ہے۔

ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا ۔ کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا

ایک مرتبہ سرکار کے ایما سے جناب داغ نے یہ مصرع سرکاری

"یہ چوٹی کسلئے پیچھے پڑی ہے"

امیر صاحب کو بھیجا اور لکھا کہ فوراً اس طرح میں غزل کہکے بھیجئے اور تلامذہ سے بھی کہلوائیے چنانچہ حضرت نے اس فرمائش کو فی الفور پورا کیا۔

یہ غزل صنمخانہ عشق میں چھپی ہے اس جگہ چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

غضب کی پھوٹ الفت میں پڑی ہے ۔ ملا ہے دل جو آنکھ اس سے لڑی ہے

نہ نرگس چشم فتاں سے لڑی ہے ۔ کہ آنکھوں کو لئے نرگس پڑی ہے

شب غم مجھسے بیٹھا جائے کیونکر ۔ تری تصویر تو آگے کھڑی ہے

فلک کو پھونکتی ہے آہ دل کی ۔ ذرا سی شمع لو اتنی بڑی ہے

بڑی جھگڑالو ہے انکی حیا بھی ۔ کہ اک اک بوسہ پر پہروں لڑی ہے

ملا کر خاک میں آئے ہو کس کو ۔ یہ کیسی گرد دامن پہ پڑی ہے

نگاہِ ناز ہوتی ہے برآمد — سلامی کو صفِ مژگاں کھڑی ہے
میری میت کو ٹھکرا کر وہ بولے — کہاں کی نیند تمکو چھٹ پڑی ہے
نہیں پلکوں کی اوجھل میں وہ پتلی — دلھن چلمن میں شرمائی کھڑی ہے

جب یہ تازہ افکار ملاحظے سے گزرے تو حضرت غفران مکان کو حضرت امیر کی جانب جو توجہ تھی اُسمیں بہت اضافہ ہوگیا۔ اور مصاحبین جو حضرت امیر کو یہاں آنے پر مجبور کر رہے تھے انکو اس امر میں اور بھی اصرار کا موقع ملا مگر امیر کے یہاں آنے کی بظاہر کوئی صورت نہ تھی ایک تو پیرانہ سالی دوسرے یک درگیر محکم گیر پر انکا عمل تھا۔ نواب کلب علیخاں خلد آشیاں کی رحلت سے اہل کمال کا شیرازہ منتشر ہوگیا تھا بعض شعرا بھی رامپور چھوڑ کر اپنی اپنی طرف راہی ہوگئے تھے۔ آغا صاحب حیدر آباد چلے آئے تھے مگر امیر کی وضعداری نے ریاست کو اور ریاست کے تعلقات نے امیر کو نہ چھوڑا۔ البتہ امیر کو جس بات کی خواہش تھی وہ یہ تھی کہ امیر اللغات کی تکمیل ہو جاتی اور اسکے ساتھ یہ بھی خیال رہتا تھا کہ [illegible] کے قابل ہیں اللغات کہیں [illegible] نہ ہو جائے۔

[illegible] میں حضرت غفران مکان مع اسٹاف و خدم و حشم کلکتہ تشریف لیگئے۔ امیر صاحب کو اطلاع ملی کہ کلکتہ سے واپس ہوکے بنارس میں اعلیحضرت قیام فرما ہونگے آپ اس موقع پر بنارس آگئے چونکہ یہ موقع حسن اتفاق سے ہاتھ آیا تھا۔ حضرت امیر مع اعزہ و احباب کے بنارس تشریف لیگئے حضور اقدس اعلیٰ جب ہز ہائنس مہاراجہ بنارس کی کوٹھی میں فروکش ہوئے تھے مصاحبین نے عرض کیا کہ امیر مینائی حاضر ہیں۔ یہ سنکر اعلیحضرت اندر سے باہر آگئے اور فرمایا

کہاں ہیں امیر صاحب حضرت حاضر ہوئے تو حضور والا ہاتھ پکڑ کر اندر لیگئے اس موقع پر حضرت امیر نے سرکار کے ارشاد سے ایک مسدس پڑھا جو اسی سفر میں کہا تھا۔ ہر شعر پر اعلحضرت بیحد تعریف فرماتے تھے۔ جب مسدس ختم ہوا تو فرمایا کہ آپ ہمارے ساتھ حیدرآباد چلئے۔ حضرت نے عرض کیا کہ میں قدیم نمکخوار ریاست رامپور کا ہوں وہاں سے اجازت لینا ضروری ہے لہذا میں اسوقت حیدرآباد کیلئے تیار ہوکر نہیں آیا۔ مصاحبین نے عرض کیا کہ بیشک امیر صاحب کو چلنا چاہیئے اور ضرور چلینگے۔ اسکے بعد دربار برخاست ہوا سب باہر آئے اور مصاحبین کے ڈیرے میں محفل احباب گرم ہوئی۔

داغ صاحب نے اپنی غزل سنانی شروع کی جسکے چند شعر یہ ہیں۔

خار حسرت بیان سے نکلا — دل کا کانٹا زبان سے نکلا

عذر اُنکی زبان سے نکلا — تیر گویا کمان سے نکلا

فتنہ گر کیا مکان سے نکلا — آسمان آسمان سے نکلا

کہا گئے تھے وفا کا دہو کا ہم — جھوٹ سچ امتحان سے نکلا

تم ہنستے رہے سر محفل — کچھ بھی میری زبان سے نکلا

پڑ گیا جو زبان سے تیری حرف — پھر نہ وہ اپنے کان سے نکلا

مرگئے ہم مگر ترا ارمان — دل سے نکلا نہ جان سے نکلا

وہ چلے لب تمہارے وعدے پر — وہ تمہاری زبان سے نکلا

پھر سے آنسو کی اسنے کی تعریف — خوب موتی یہ کان سے نکلا

ذکر اہل وفا کا جب آیا — داغ اُن کی زبان سے نکلا

حضرت نے تعریف کی اور سب حاضرین نے داد دی بعدازاں امیر صاحب سے فرمائش کیگئی کہ آپ بھی کچھ فرمائیں۔

امیر نے ایک مطلع اور چند شعر ایک دوسری زمین کے پڑھے۔ اور سامعین کو بسمل کر دیا۔

زبان ضعف پیری میں چلتی رہی — سحر ہو گئی شمع جلتی رہی

پہلو بچاؤں اُس سے جو دل کو سنبھال کے — مارے چھری وہ بات میں پہلو نکال کے

آئے ہیں سر میں عطر دلھن کا وہ ڈال کے — کیا کیا سہاگ ہیں مرے روزِ وصال کے

مشکل بہت پڑیگی برابر کی چوٹ ہے — آئینہ دیکھیے گا ذرا دیکھ بھال کے

دستِ اجل سے عشق میں گلبازیاں رہیں — سر رکھدیا ہے وار پہ ہمنے اُچھال کے

اے جان اپنے غمزے کو تم روکتے نہیں — بیدرد لیچلا ہے کلیجا نکال کے

میرے تمہارے بیچ میں آتا ہے بار بار — کمبخت پاؤں بھی نہیں تھکتے ملال کے

دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سب آپ کا — دل لیجیے مگر مرے ارماں نکال کے

آئی سحر اِدھر کہ اُدھر شام ہو گئی — دو دو گھڑی کے ہونے لگے دن وصال کے

راہِ فنا نہ گردِ رواں سے بھی طے ہوئی — شعلے بھی رہ گئے ہیں زبانیں نکال کے

اعلیحضرت کا اسپیشل حیدرآباد روانہ ہوا اور گلبرگہ شریف پہونچکر حضرت امیر کی یاد ہوئی۔ مصاحبین نے عرض کیا کہ وہ بنارس میں حیدرآباد کیلئے تیار ہوکر نہیں آئے تھے اب جلد حاضر ہونگے۔

مسدس جو پڑھا گیا تھا اکیس بند کا تھا۔ اس جگہ تمہید کے چند بند درج کئے جاتے ہیں۔

مسدس

اللہ اللہ نیا رنگ ہوا عالم کا　　پرتوِ مہر سے ذرے کا ستارہ چمکا
بڑھ گئے قطرے سے ملا بحرِ کرم حاتم کا　　آئینۂ دل کا بنا جامِ جہاں بینِ جم کا
آسمانوں نے درِ فتح و ظفر کھول دیئے
سر پہ نسرین ہما بن گئے پر کھول دیئے

چترِ اقبال نے پامال پہ سایہ ڈالا　　فخر کا تاج ہوا پائے طلب کا چھالا
بن گئے داغِ جگر پھول کھلا گلِ لالا　　ہو گیا نالۂ موزوں دل قدِ سروِ بالا
شہ جو پائی نگہ شاہِ ظفر پیکر کی
آبرو چھین لی اشکوں نے مرے گوہر کی

مثلِ گل آج ہوا خواہ کھلے جاتے ہیں　　غیب سے گوہرِ مقصود ملے جاتے ہیں
شکر آتا ہے زبانوں پہ کھلے جاتے ہیں　　حسرتِ دل سے یہ کہتی ہیں کہ ہم جاتے ہیں
دل بڑھا جاتا ہے سرکار کی ہمت کی طرح
غم گھٹا جاتا ہے بدخواہ کی قسمت کی طرح

کچھ عجب رنگ ہے زیرِ فلکِ مینائی　　جھومتی آتی ہے مستی ہے گھٹا پر چھائی
غنچۂ دل جو کھلا پھول کی خوشبو آئی　　ڈوب کر عطرِ مسرت میں صبا اتر آئی

خم بھرے شیشے کھلے دورِ ساغر آیا
چرخ کہتا ہے کہ لیسنا مجھے چکر آیا

اُٹھ گئے آج درِ دل سے وہ پردے گر کے — جگمگے مہر طرح کی امید کے بیٹھے پھر کے
موجیں آہوں کی نہیں سا غر کے لہرے — باشتہ ہی کی یہ کان عدو کے بہرے

کھل گیا غنچۂ طالعِ مسعود کا آج
سامنا ہو ہی گیا شاہدِ مقصود کا آج

بن کے پیشانیِ محبوب نصیبا چمکا — رنگیا ڈوب کے تارا شبِ تارِ غم کا
چشمۂ مہر ہوا دیدۂ زرتشتم کا — اب ہے سہرا اور وہ امید گہِ عالم کا

بخت جاگے ہوئے ہیں عالمِ ہشیاری ہے
خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ بیداری ہے

اللہ اللہ یہ وہی بارگہِ عالی ہے — سرِ گردوں کو جہاں حسرتِ پامالی ہے
عیش و عشرت سے بھری کلفتوں سے خالی ہے — ہاتھ باندھے ہوئے استادہ خوش اقبالی ہے

سطوتِ رعب ادب اپنی ہوا باندھے ہے
لشکرِ لطف و عنایات پرا باندھے ہے

داغ مرہم سے ملا درد دوا تک پہونچا — ذرہ اسد رحم بڑھا اوجِ سما تک پہونچا
در [illegible] دستِ عطا تک پہونچا — تھا جو ناکام وہ اب کام روا تک پہونچا

لب پہ آتے ہی دعا بابِ اثر تک پہونچی
نخل سے پھوٹتے ہی شاخ ثمر تک پہونچی

ہوشیار او دلِ مستانۂ صہبائے حضور — تا کجا جوششِ دریائے تمنائے حضور

لطف یہ ہے کہ سر عجز ہو اور پائے حضور　　دل جدا آنکھ جدا محو تجلائے حضور

بات جو نکلے مسلسل رہے مربوط رہے
دامن پاس ادب ہاتھ میں مضبوط رہے

کسکی جانب ہے الٰہی یہ مرارت سخن　　آج کچھ اور ہی ہے رنگ سخن بوئے سخن
بن گئی فکر رسا شانۂ گیسوئے سخن　　بات جب ہے کہ نہ چھوٹے کوئی پہلوئے سخن

شعر اونچے سے جو اونچا ہو زباں پر آئے
تو سہی عرش سے مضمون اتر کر آئے

یہ سخن وہ ہے جو ہے روح سخن جان سخن　　مدح سلطان کی ہے کیوں نہ ہو سلطان سخن
شان دربار یہ کہتی ہے بڑھی شان سخن　　ہاں سخنور یہی گو ہے یہی میدان سخن

ہوں سب اشعار رسیلے کہ بنارس یہ ہے
شش جہت میں ہو یہ شہرہ کہ مسدس یہ ہے

سفرِ حیدرآبادِ دکن

حضرت امیر کے بعض فرزند جو ملازمت کے خواہاں تھے اور حضرت کو بھی انکی بیکاری گراں تھی انکی کوشش و ترغیب بار بار حضرت کو اس جانب مائل کرتی تھی کہ سفرِ دکن اختیار کیا جائے زمانۂ دراز سے اس خاندان کے بیشتر افراد سلطنت دکن کے نمکخوار اور ممتاز عہدوں پر فائز تھے اسلئے سلطنت آصفیہ فرزندان امیر کے لئے

کوئی بیگانہ مقام نہ تھا مگر بایں ہمہ حضرت کو پیرانہ سالی اور نادرستی مزاج مانع رہتی تھی اب جبکہ بنارس میں اعلیحضرت سے ملنے کا شرف بھی حاصل ہو گیا تھا اور ارکانِ دولت ایمائے خسروی سے مصر رہتے تھے کہ سفر دکن کیا جائے حضرت امیر کو تامل کا موقع نہ رہا۔ فرزندوں کی خواہش کے ساتھ تکمیلِ امیر اللغات کا خیال بھی حضرت کو کچھ کم نہ تھا جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اور ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ زیارتِ روضۂ مبارک حضرت بندہ نواز گیسو دراز کا اشتیاق حضرت امیر کو ایک عمر سے تھا کیونکہ ارادت وعقیدت بزرگانِ ملت سے حضرت امیر کو پیدائشی تھی۔ اور حضرت بندہ نواز تو حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے چشم و چراغ ہیں جن سے مخدوم شاہ میناؒ کا سلسلۂ طریقت منور ہے۔ اس غرض سے ریاست رامپور سے رخصت لیکر حضرت دوسری بار بھوپال آئے کیونکہ راہ میں بوجہ بُعدِ مسافت کسی نہ کسی جگہ توقف کرنے کی ضرورت تھی۔ سرکار عالیہ نے حضرت امیر کو حسب سابق باعزازِ تمام مہمان کیا اور ایکماہ کے بعد رخصت فرمایا۔ حضرت مع دو فرزندوں لطیف احمد صاحب اختر مینائی۔ مسعود احمد صاحب ضمیر مینائی اور برادر زادہ لیاقت حسین صاحب مینائی۔ اور خادم راقم الحروف کے گلبرگہ تشریف لاکر فاتحہ و زیارت سے مشرف ہوئے۔ دکن سے احباب امیر کے خطوط اور طلب کے تار بھوپال ہی میں آنے لگے تھے اور اب گلبرگہ شریف پہونچنے پر تو خطوط اور تار وں کا تانتا بندھ گیا دو روز قیام کرنے کے بعد حیدرآباد کی جانب روانگی عمل میں آئی۔ اعلیحضرت کے مقربانِ خاص میں کئی صاحب حضرت سے ارادت وعقیدت

حضور اقدس و اعلیٰ کے ایما سے محمد ابراہیم صاحب ہر روز مزاج پرسی کیلئے آتے تھے اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ میں نے مصرع طرح تجویز کیا ہے۔ آپ کی طبیعت درست ہو جائے تو بھیجوں گا۔ محمد ابراہیم صاحب کا بیان تھا کہ میں نے عرض کیا کہ سرکار مصرع طرح عنایت فرما دیں تو ارشاد ہوا کہ نہیں امیر صاحب کی طبیعت پر بار پڑنا مضر ہوگا۔ جنابِ داغ نے تیمارداری اور علاج میں دلسوزی کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔

ایک مہینہ تک جب مرض میں افاقہ نہ ہوا تو اطبا کی رائے سے مکان تبدیل کیا گیا تو پ کے سانچہ پر نواب منہور الملک بہادر کے بنگلہ کے قریب ایک بنگلہ میں اُٹھ گئے۔ علاج میں بہت کوشش کی گئی مگر مشیت الٰہی کے آگے کوئی تدبیر کیا کام آسکتی ہے الغرض ایک مہینہ آٹھ روز علیل رہکر ۱۸ جمادی الثانی ۱۳۱۸ھ گزرنے کے بعد نصف شب کو واصل بحق ہوئے۔

افسوس تجھکو رحم نہ آیا کچھ اے اجل
مارا کہاں امیر غریب الدیار کو

نماز جنازہ مولوی فضل حق صاحب فرزند مولوی عنایت علی صاحب دہلوی نے پڑھائی۔ درگاہِ حضرت یوسف صاحب و شریف صاحب میں مدفون ہوئے۔

لوحِ مزار پر یہ تاریخ کندہ کی گئی

امیرِ کشورِ معنی امیر مینائی | خدا کے عاشقِ صادق ورنبی کے فقیر
گئے جو خلدِ بریں کو تو انکی تربت پر | جلیل نے یہ لکھا روضۂ جناب امیر ۱۳۱۸

جس پتھر پر تاریخ کندہ ہے اسکی پشت پر جو بیرونی جانب ہے صاحبِ مزار کا

یہ شعر جلی حروف میں نقش ہے اور دور سے پڑھا جاتا ہے۔

ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں
پھر اسقدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے
امیر

مولانا سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوری کو جنھیں حضرت امیر سے ایسا اتحاد تھا کہ یک جان و دو قالب تھے جسوقت اس واقعہ کی خبر پہونچی راقم الحروف کو تحریر فرمایا کہ امیر کے مزار پر جا کر میری طرف سے سلام کہو اور یہ شعر پڑہو

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست   تا نہ پنداری کہ تنہا میروی

حضرت امیر کا ماتم تمام اخبارات و رسائل میں بہت دنوں تک کیا گیا۔

امیر مغفور کا یہ سفر سفر آخرت تھا قضا و قدر کے عجیب کرشمے ہیں کہاں پیدا ہوئے کہاں عمر بسر کی اور کہاں موت آئی بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوتُ کے یہی معنی ہیں سوا خدا وند علام الغیوب کے کوئی نہیں جانتا کہ کس زمین پر مریگا۔ حالت مرض میں ایکدن حضرت نے فرمایا تھا کہ یہاں مرنے کے لئے آنا ہوا ہے اثنائے راہ میں ایک مسدس مدحیہ سرکار کہا تھا اسمیں بعض مصرع ایسے ہیں جن سے سفر آخرت کا اشارہ پایا جاتا ہے۔

آپ کا ایک مشہور شعر یہ بھی ہے جو دیوان نعتیہ میں چھپا ہے۔

اب نہ ٹھہروں جو کرے میری خوشامد بھی وطن
کہ پکارا ہے غریب الوطنی نے مجکو

لفظ غریب الوطنی میں تاریخ رحلت نکلتی ہے یعنے ۱۳۱۸ عدد ہیں جو
اُنکی وفات کا سال ہے۔ بعض شاعروں کی اس پر نظر پڑی اور اخباروں
میں یہ شعر بار بار چھاپا گیا کیونکہ غربت میں موت آنے کی اس سے زیادہ
کیا صراحت ہوگی اور یہ عجیب پیشین گوئی تھی۔
حضرت امیر کی موت ویسی ہی ہوئی جیسی اہل اللہ کی ہوتی ہے آخر دم تک
نہایت بیدار رہے اُنکے ایما سے قرآن پاک کی سورتیں پڑہی جاتی تھیں اور
وہ خود ذکر میں مشغول تھے۔ دیر تک یہ حالت رہی اسی حالت میں ایکبار
آنکھیں کھول کے کسی کو غور سے دیکھا اور روح پرواز کر گئی[1] معلوم نہیں کہ
کیا دیکھا۔ اللہ تعالیٰ اُنکے مراتب قرب و اختصاص بلند کرے اور اُنکی حرمت
سے بطفیل حضرت رحمۃ للعالمین ہم سب کی مغفرت فرمائے۔ حضرت
پہلے سے ایک وصیت نامہ لکھ گئے تھے جسمیں سب مسلمانوں خصوصًا اعزا
و احباب سے دعائے مغفرت و ایصال ثواب کی التجا کی تھی۔ حسب
ہدایت وہ وصیت شایع کر دی گئی اور ہر جگہ اُسکی تعمیل بھی ہوئی۔

---

[1] جس کمرے میں آپکا پلنگ تھا ایک لمپ روشن تھا نزع کی حالت شروع ہوتے ہی اُسکی
روشنی گھٹ گئی اور بتدریج کم ہوتی گئی جسوقت روح نے پرواز کی لمپ خود بخود گل ہوگیا۔
خیال ہوا کہ شاید تیل نہیں ہے مگر دیکھا تو تیل موجود تھا۔

قطعاتِ تاریخ وفات

رحلتِ امیر کی صدہا تاریخیں شعرا نے کہیں اور اخباروں میں چھپی ہیں
اس جگہ چند تاریخیں نقل کیجاتی ہیں۔

از عالیجناب مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت پیشکار و صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

از دارِ جہاں امیر رفتہ فریاد — گفتا رضواں کہ گشت فردوس آباد
گفتیم دعائیہ چنیں سالِ وفات — محمود بود آخرتِ او۔ ای شاد
۱۸ ۱۳ ھ

از جناب نواب فصیح الملک بہادر داغ دہلوی

وائے ویلا چل بسا دنیا سے وہ — جو مرا ہم فن تھا میرا ہم صفیر
مصطفیٰ آباد سے آیا دکن — یہ سفر تھا اُس مسافر کا اخیر
مبتلائے حدّتِ صفرا و تپ — مورد آزار اسہال و زحیر
گو بظاہر تھا امیر احمد لقب — در حقیقت باطناً پایا فقیر
شاہ مینا سے ہے نسبی سلسلہ — شاعری میں خاص تلمیذ امیر
ہے دعا بھی داغ کی تاریخ بھی — قصرِ عالی پائے جنت میں امیر
۱۸ ۱۳ ھ

ولہ

چل بسے داغ کے بہت احباب | رات دن جنکے غم میں ہے دلگیر
آج اس غم کی یہ کہی تاریخ | اب ہوا دلپہ آہ داغ امیر
۱۳۱۸

ولہ

کر گئے رحلت امیر احمد امیر | اب نشاطِ زندگی جاتا رہا
ملگئی تاریخ دل سے داغ کے | آہ لطفِ شاعری جاتا رہا
۱۳۱۸ھ

از جناب حکیم سید ضامن علی صاحب جلال لکھنوی

کجا امیر کجا سرزمین ملکِ دکن | کہاں قیام تھا مدفن کہاں ہوا انکو نصیب
جلال لکھدو یہ تاریخ انکی رحلت کی | امیر ہوگئے صد وای ایک مرد غریب
۱۹۰۰ء

از جناب مولوی حافظ ساجد علی صاحب صبا کاکوروی وکیل درجہ اول ورنگل آباد دکن شاگرد حضرت امیر

دریغا کہ مہر سپہر کمال | امیر عوالی مراتب بمرد (مناصب)
سخن بود پیکر روانش امیر | چہ گویم چہ عالی مناقب بمرد
کنون آن کجا آب و تاب سخن | کہ شاعر جلیل المراتب بمرد
سنہ ۱۳۱۸

از مولف حقیر

جلیل نے سرِ بزمِ عزا یہ پوچھا آج — وہ کون تھے جنہیں روتے ہیں سارے شیدائی
پڑھا جواب میں ٹھکرا کے اپنے مصرع — امیرِ کشورِ معنی امیر مینائی

۱۳۱۸ ھ

بعض حالات و مقالات

حضرت امیر خلق مجسم اور سراپا تہذیب تھے کبھی کسی کی برائی اُنکی زبان سے نہیں سُنی گئی۔ اور وہ کسی کی برائی سُنتے بھی نہ تھے۔ شگفتہ مزاج تھے۔ کوئی کیسی ہی خطا کرے خفا نہیں ہوتے تھے شریر سے شریر اور خائن ملازم کو بھی کبھی علیحدہ نہیں کیا۔ اطفال اور خدام کو بھی تم اور آپ کے سوا کبھی تو کہکے مخاطب نہیں کرتے تھے زہد و ورع اُن کی فطرت میں تھا۔ فتوے پر تقوے کو اختیار کرتے تھے۔ اُن کے دو ہی مشاغل تھے عبادات و ریاضات یا تصنیف و تالیف اُن کی صحبت میں سوا دینی اور علمی تذکرے کے اور کسی چیز کا ذکر مشکل سے آتا تھا۔ اگرچہ حضرت امیر کو دربار سلاطین سے تعلق رہا۔ مگر درحقیقت وہ دنیا دار نہ تھے۔ بظاہر امیر تھے باطناً فقیر۔ تقریباً ہر ایک سے دُعائے حسن خاتمہ کی فرمائش کرتے تھے خطوں میں لکھتے بھی تھے۔ جناب داغ دہلوی نے بہت

صحیح کہا ہے۔

گو بظاہر تھا امیر احمد لقب　　　　در حقیقت باطن آگاہ پایا فقیر

میاں صاحب قبلہ (مولانا سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوری) اور حضرت شاہ محمد معصوم صاحب نقشبندی المجددی سے انتہا کا خلوص تھا انہیں سے روزانہ صحبت رہتی تھی ظاہر ہے کہ یہ کیسی صحبت ہوگی۔

میاں صاحب قبلہ کے والد ماجد مولانا سید حسن شاہ صاحب محدث بھی جو صورتاً و سیرتاً صحابہؓ سے مشابہ تھے امیر صاحب سے غایت درجہ اُنس رکھتے تھے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ منشی صاحب عزیز الوجود ہیں۔

حضرت امیر میں نورانیت ایسی تھی جس سے انکی روشندلی ظاہر ہوتی تھی ایک دن ایک بزرگ نے کہا کہ منشی صاحب کی صورت دیکھنے سے ایمان تازہ ہوتا ہے اسپر میاں صاحب قبلہ نے فرمایا کہ جو آپ لکھتے ہیں میں بھی وہی لکھتا ہوں۔

میاں صاحب قبلہ بارہا فرمایا کرتے تھے کہ منشی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے عجیب جامع کمالات پیدا کیا ہے اگر اہل فراست کے زُمرے میں دیکھا جائے تو وہ وزیر سلطنت ہونیکی قابلیت رکھتے ہیں اگر اہل علم کے زمرے میں دیکھا جائے تو سرتاج علما ہیں اگر درویشوں کے زمرے میں دیکھا جائے تو سب کے مرشد ہیں اگر شعرا کے زمرے میں دیکھا جائے تو ملک الشعرا ہیں۔

حضرت امیر نے کسی شاگرد کی نسبت کبھی یہ نہیں کہا کہ میرے شاگرد ہیں

ناک یہ کہتے تھے کہ میرے احباب میں ہیں جب کوئی اُنکے کمال کی تعریف کرتا تو
تو کبھی یہ کہتے کہ ع

عالم ہمہ پُر ز نادہ ما ہیچ

اور کبھی یہ کہتے تھے کہ جب کامل اٹھ جاتے ہیں تو ناقص ہی کو لوگ کامل
کہنے لگتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اُنھوں نے کبھی اپنے آپ کو کچھ سمجھا ہی
نہیں یہی دلیل اُنکے کمال کی ہے۔

کسی شاگرد نے اُنکے کسی شعر کی تعریف اُنکے سامنے نہیں کی غالباً اُنکو
یہ خیال ہوگا کہ ہمارا تعریف کرنا چھوٹا مُنہ بڑی بات ہے۔

میں نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ حضرت کی مشقِ سخن دیکھکے حیرت ہوتی ہے
کسی اُستاد میں یہ بات نہو گی اس کے جواب میں فرمایا کہ میاں جلیل میری مشق کیا ہے
مشق تھی حضرت امیر کی میں اُنکے سامنے ایک قطرہ ہوں اسی طرح میں نے بھی
ایک مرتبہ اُن سے عرض کیا تھا کہ آپ کی مشاقی دیکھکر حیرت ہوتی ہے اُنھوں نے
فرمایا کہ میاں امیر میری مشق کیا ہے مشق تھی حضرت مصحفی کی وہ سمندر تھے
میں اُنکے سامنے ایک قطرہ ہوں۔

فرماتے تھے کہ شاعر جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اپنے کسی لایق شاگرد کا شاگرد
ہو جاتا ہے یعنی لایق شاگردوں کو ہدایت کیجاتی ہے کہ وہ اُستاد کا کلام غور سے
دیکھیں اور اگر کہیں کوئی کمزوری نظر آئے تو اُس سے آگاہ کردیں
یہ ارشاد شاید اس وجہ سے ہوگا کہ حضرت امیر کا دستور تھا کہ اپنا کلام اُسوقت
تک شایع نہیں کرتے تھے جبتک امیر نظرِ غور سے دیکھ نہ لیتے تھے۔

فرماتے تھے کہ انسان میں دو جوہر ہونا لازم ہے۔ اللہ سے ڈرنا اور کمال پیدا کرنا۔
فرماتے تھے کہ لوگ دنیا کے تکلفات کو باعثِ عزت سمجھتے ہیں یہ اُنکی غلطی ہے
عزت صرف کمال پیدا کرنے میں ہے۔

عمدہ لباس۔ عمدہ غذا۔ عمدہ مکان وسامان پر اُنکو مطلق نظر نہ تھی اگرچہ
یہ سب چیزیں اللہ نے اُنکو دی تھیں۔

اہلِ علم وفضل جو باہر سے رامپور آتے تھے حضرت سے ضرور ملتے تھے۔ مولوی
مشتاق حسین صاحب وقارالملک۔ مولوی مہدی علیخاں صاحب محسن الملک
اور مولوی ذکاءاللہ صاحب دہلوی۔ مولانا حالی۔ مولانا شبلی۔ ان سب اصحاب کو
حضرت کے پاس آتے میں نے دیکھا ہے۔

فرماتے تھے کہ مرزا غالب کی ذہانت اور اُنکی طبیعت کا ہر وقت حاضر رہنا
غیر معمولی تھا۔ اُن کا یہ شعر اکثر پڑھتے تھے اور اسکو بہت پسند کرتے تھے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھکے قدم میں نے پاسباں کیلئے

فرماتے تھے ضعف پیری کی وجہ سے مرزا غالب کو اصلاح دینا بار ہوتا تھا جس شاگرد کا
کلام آتا فقط ایک مطلع دیکھ لیتے اور واپس کر دیتے کہ اس سے زیادہ طاقت نہیں ہے۔
رامپور میں مرزا غالب سے ایک سقے نے امداد طلب کی تھی کہ لڑکی کا عقد
درپیش ہے اُنھوں نے امداد کا وعدہ کر لیا تھا۔ اتفاق سے رامپور سے رخصت ہو کر
دلی کو چلے اور رخصتانہ نہ ملا شاید نواب صاحب کو خیال نہیں رہا تھا حضرت میر کو
خیال آیا تو نواب صاحب سے عرض کر کے رخصتانہ بھجوایا۔ اُنکی پالکی شہر سے باہر

جا چکی تھی چوبداروں نے پہونچکر رستم بیٹی کی مرزا صاحب نے پالکی وہیں رکھوالی اور چوبداروں سے کہا کہ فلاں بھتے کو میرے پاس بھیجو میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں غرض جب وہ آیا اور اُسکو روپیے دیچکے تب پالکی اٹھائی گئی

امیر صاحب کی زبان پر یہ اشعار اکثر آتے تھے۔

ستم ست گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درا
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ در دل کشا بہ چمن درا — مرزا بیدل

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی — گو مشتِ خاکِ ما ہم برباد رفتہ باشد — حزین

دل کو نالوں کی دم نزع ہوس باقی ہے — منزل آخر ہوئی فریادِ جرس باقی ہے۔ اسیر

لگیں تلواریں چلنے اس ادا پر بانکوں ترچھوں میں
ذرا کج ہو کے بیٹھا تھا وہ قاتل پشتِ توسن پر — مصحفی

نہیں کیا جو تربت پہ میلے رہے — یہ سب کچھ ہوا ہم اکیلے رہے — سحر شاگرد ناسخ

نازکی اُن کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے — میر

تر دامنی پہ شیخ تو میری نجائیو — دامن نچوڑ دوں تو فرشتے وضو کریں — خواجہ میر درد

ہر طرف مصروف ہیں زاہد نمازِ صبح میں ۔ گردنِ مینا کو بھی لازم ہے اب خم کیجیے ناسخ

دل کو رکھ دیتے ہیں یہ کہکر کمان دار نہیں ہم ۔ جو اُڑا دے اس نشانے کو وہ تیر انداز ہے آتش

مرزا دبیر میر انیس دونوں کو باکمال سمجھتے تھے اور دونوں کے مداح تھے فرماتے تھے کہ انیس کی چست بندشیں قابل آفریں ہیں ایسے ہی چست شعر کہنا چاہیئے

سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو ۔ ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے ۔ چُنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو
لگا رہا ہوں میں گلہائے نو کے پھر انبار ۔ خبر کرو میرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

خیالِ خاطرِ احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

فرماتے تھے کہ "سدا کا لفظ بہت فصیح ہے متوسطین نے اسکو ناحق ترک کر دیا میرا جی چاہتا ہے کہ اسکا استعمال کروں" مگر کبھی استعمال نہیں کیا اور لطف یہ ہے کہ داغ صاحب سے جب حیدرآباد میں یکجائی ہوئی تو انکو بھی یہی کہتے سنا کہ سدا کا لفظ استعمال کرنے کو جی چاہتا ہے" مگر انہوں نے بھی کبھی استعمال نہیں کیا یہ ان حضرات کی احتیاط کا مقتضا تھا ورنہ استعمال کیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

مزاح کو حضرت پسند کرتے تھے بشرطیکہ اُسمیں کوئی ندرت اور متانت ہو۔

جناب تسلیم نے ایک شعر سنایا۔

بے حجاب اسکو کیا شوخی نے میری وصل میں ۔ اک بات ایسی کہی جامہ سے باہر ہو گیا۔

حضرت نے اُن کے کان میں کہا کہ آپ نے بڑی بی کہہ دیا ہوگا۔
حضرت امیر کی طبیعت میں گرمی اور شوخی بے انتہا تھی جو شاعری تک محدود تھی بعض لوگ کہتے تھے کہ حضرت کو دیکھنے کے بعد تعجب ہوتا ہے کہ یہ شاعری انہیں کی ہے۔
میاں صاحب قبلہ نے ہارون رشید کا ایک تاریخی واقعہ حضرت سے بیان کیا اس میں حسین عورت کا بھی کچھ سلسلہ تقریر میں میاں صاحب نے حضرت سے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ مسلمان سے بڑھکر عورت کا کوئی قدر دان نہیں ہوتا (یعنے مسلمان اس صفت میں سب قوموں سے بڑھے ہوئے ہیں) اس پر حضرت بے اختیار ہنسے اور ہمیشہ اس برجستہ فقرے کو یاد کرکے تبسم فرماتے تھے۔
راوی تھی مولوی ولی محمد خاں رامپوری کو جو فارسی گو تھے اپنے شعر سنانے کا بہت شوق تھا اور مرزا غالب اس سے واقف ہو چکے تھے ایکدن رامپور میں خانصاحب موصوف غالب سے ملنے آئے۔ اور حسب عادت شعر پڑھنا شروع کیا۔ ایک مطلع سنتے ہی غالب نے کہا کہ مجھکو اٹھاؤ (ضعف کی وجہ سے اٹھنے میں سہارا درکار ہوتا تھا) لوگوں نے اٹھایا۔ مرزا صاحب ولی محمد خاں کے گرد پھرے۔ سر پر بوسہ دیا اور کہا اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔
ایک دن باہر کے بعض قابل لوگ حضرت سے ملنے آئے مسائل شاعری کے متعلق استفادہ کیا بعد ازاں حضرت سے کہا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ دیر گاہ سلامت رکھے آپ کے بعد ہم ایسے حاجتمندوں کو کس سے رجوع کرنا چاہیئے ہیں (راقم الحروف) الگ بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا حضرت نے انکے جواب میں میری طرف ہاتھ سے اشارہ کرکے فرمایا کہ ان سے رجوع کرنا چاہیئے وہ لوگ اُٹھے اور مجھ سے مصافحہ کیا میں اس واقعہ سے سخت حیرت زدہ ہوا اور شرم سے آب آب ہو گیا کیونکہ حضرت کے بہت سے

قابل و فاضل قدیم تلامذہ موجود تھے جنکے آگے میری کوئی ہستی نہ تھی۔

علمِ عروض کے تمام جزئیات اور زحافات جسطرح حضرت امیر کو مستحضر تھے ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے۔ کتاب شجرۃ العروض مصنفہ حضرت امیر اُن کے صاحبزادوں کے ساتھ میں نے بھی اُن سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے۔

فرماتے تھے کہ میرے استادِ معقولات مفتی سعد اللہ صاحب کی طبیعت موزوں نہ تھی مگر عروض کی خدمت کرنے سے موزون ہوگئی۔ عروض میں مفتی صاحب کی تصنیف معیار مشہور ہے جسکی شرح زرِ کامل عیار حضرت امیر نے لکھی ہے۔

شاگردوں کی اصلاح و تعلیم کی جانب خاص توجہ تھی اور وہی توجہ اس کا باعث ہوئی کہ کثرت سے لوگ فیضیاب ہوئے۔

کوئی صاحب شعر سنانے کی اجازت چاہتے تو اُن سے حضرت امیر فرماتے تھے۔

ہمہ گوشیم بیا چہ سرائی

اب جبکہ حضرت امیر استاذ الاساتذہ تھے اکثر فرماتے تھے کہ اگر حضرت امیر زندہ ہوتے تو اب بھی میں اپنا کلام اصلاح کے لئے پیش کرتا۔

حضرت اپنے شاگردوں سے اکثر فرماتے تھے۔ ع

دورِ مجنوں گذشت و نوبت ماست

یعنے میری قوت گویائی ہو چکی اب تمہاری زور آوری کا زمانہ ہے جسطرح بوڑھا پہلوان کنارے بیٹھا ہوا داؤں پیچ بتاتا ہے خود اکھاڑے میں نہیں اُترتا وہی اب میری حالت ہے۔

خطوط وغیرہ میں اپنا نام کبھی فقیر امیر احمد امیر لکھتے تھے اور کبھی فقیر امیر اور
کبھی امیر فقیر۔ غرض فقیر کا لفظ ضرور ہوتا تھا جو امیر کے لئے بالتخصیص موزوں تھا۔
فرماتے تھے جی چاہتا ہے کہ خداوند تعالیٰ مجکو دنیا سے اٹھا کے جنت میں پہنچا دے
بیچ کے مرحلوں سے سابقہ نہ پڑے اور یہ اُسکی قدرت سے کچھ بعید نہیں ہے۔

فرزندان حضرت امیر مینائی

حضرت امیر کی یادگار اُنکے پانچ فرزند ارجمند ہیں جن سے مرحوم کا نام اس دارِ فانی
میں زندہ اور باقی ہے اللہ تعالیٰ اس چمن مینائی کو سرسبز و شاداب رکھے۔
استادزادوں کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

مولوی منشی محمد احمد صاحب صابر مینائی

ان کا تخلص پہلے قمر تھا۔ اب صابر ہے فن شعر میں موجودہ عالی منزلت نواب صاحب
والی رامپور بالقابہ کے استاد ہیں جسطرح حضرت امیر نواب خلد آشیان کلب علیخان
کے اُستاد تھے علم و فضل اعلیٰ قابلیت اور صفات عالیہ سے متصف اور اپنے والد
بزرگوار کے جانشین حقیقی ہیں۔ آپکی شاعری زبردست اور آپ کی تحریر بینظیر ہے۔
نواب خلد آشیان کے عہد سے معزز خدمات پر مامور رہے اور اسوقت نواب صاحب
کے اشاف میں ممتاز صاحب علم۔ قابل محترم اور ذی اعتبار ہیں۔ آپ کا دیوان مرتب

جو ابھی طبع نہیں ہوا۔ چند اشعار گہر نثار اسجگہ لکھے جاتے ہیں۔

یہ بلا تجھ سے دلربا ملکے | ناز اُٹھانے پڑے ہیں دل کے
ہائے مجھ سے چلے وہ تیغ کی چال | مار ڈالا مجھے گلے مل کے
بن کے انجان کہتی ہے لیلیٰ | کون روتا ہے پیچھے محمل کے

دیکھ لیتا ہو جو آنکھیں انکی شرمائی ہوئی | آ نہیں سکتی زبان تک دلہن بات آئی ہوئی
اُن سے کہتی ہے نزاکت وقت آرائش قمر | جان پر یاں بنگئی ابھی خودآرائی ہوئی

لن ترانی کی صدا آئی تو موسیٰ نے کہا | آشنا کان ہیں کچھ کچھ یہ سخن کس کا ہے

کچھ اس رنگ سے غنچہ گلشن میں چٹکا | کہ یاد آگیا مجھکو بچپن کسی کا
چلے جاتے ہیں غم سے نخلِ تمنا | خزاں لوٹے لیتی ہے گلشن کسی کا

ترے پیکان کو دم بھر روک لیتا | نہ اتنا بھی ہوا میرے جگر سے
بہت رویا مرا چاک گریباں | گلے مل کر گریبان سحر سے
حیا نے وصل میں روکا ہے یکسر | کہو شوخی اب آئی کدھر سے

وہ کہتے ہیں رنگت یہ بھی میری حنا میں | کیا لعل لگے ہیں کوئی خونِ شہیداں
کیا جانیے دل ہے کہ جگر ہے وہ کسی کا | اک پھول ہے آج اُن کے گریبان قبا میں

ہائے اتنا کبھی اے خنجرِ براں نہ ہوا — تو لپٹتا مری گردن سے گریباں نہ ہوا
فیضِ صحبت سے ہوا کیا جوہرِ ناقابل کو — عکسِ انسان سے کبھی آئینہ انساں نہ ہوا
جان کر گیسوئے محبوب بلائیں لے لیں — ہیں کبھی خوابِ پریشاں سے پریشاں نہ ہوا

خورشید احمد صاحب مینائی

حضرت امیر کے خلف الرشید جناب صریر سے چھوٹے ہیں۔ ان کی طبع سلیم میں صلاحیت اور متانت خاص ہے ذکی اور ذہین استعداد ہیں۔ دفتر امیر اللغات میں جب وہ لغت زیر تالیف تھا بہت حصہ لیتے تھے شاعری کا ذوق بھی رکھتے ہیں۔

لطیف احمد اختر مینائی المخاطب نواب اختر یار جنگ بہادر

خوش فکر اور خوشگو ہیں یہ اپنے والد کے فیضِ صحبت سے زیادہ مستفید ہوئے ہیں نظر باریک ہیں اور طبیعت نقاد ہے سکۂ سخن کو خوب پرکھتے ہیں۔ اپنے والد حضرت امیر کے ساتھ ۱۳۱۸ھ میں حیدر آباد آئے تھے جب سے یہیں ہیں۔ ۱۳۱۹ سال فصلی سے تنخواہ سلطنتِ آصفیہ ہیں اسوقت حضور پرنور کے الطاف خسروانہ سے محکمۂ عالیہ امور مذہبی کے ناظم اور معتمد ہیں۔ پاکیزہ اخلاق و نفیس مزاج ہیں۔ آگے شعر بہت کہتے تھے مگر اب بوجہ مصروفی کار سرکار شاعری کا موقع کم ملتا ہے تھوڑے سے اشعار ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

جوبن ہے ان دنوں جو تمہارا ابھار پر
دونی بہار ہے چمنِ روزگار پر

بجلی گرا دو ہنس کے نہ تم لالہ زار پر
آتی ہے آنچ میرے دلِ داغدار پر

دو ایک روز کیلئے چھپنا قمر کا ہے
ہونے دو ہے نقاب اگر روئے یار پر

آرائشوں میں رہتے ہیں مصروف نازنین
کچھ نازکی کا بس نہیں چلتا سنگار پر

اے اضطراب تجھ کو پسند آئی کیا ادا
تو ہے جو لوٹ پوٹ دلِ بیقرار پر

مستانِ عشق کو ہے ہمیشہ چڑھی ہوئی
موقوف یہ جنوں نہیں فصلِ بہار پر

چینِ جبیں ہے محو اسی اہتمام میں
گردِ نظر پڑے نہ کہیں روئے یار پر

کچھ سیرِ گل کا شوق نہیں گلعذار کو
مدِ نظر ہے چوٹ عروسِ بہار پر

یہ ارتباطِ شانہ و آئینہ تا کجا
برہم نہ سادگی ہو تمہارے سنگار پر

مستانِ شوقِ دید کو پروا نہیں کوئی
اٹھ جائے یا نقاب رہے روئے یار پر

اختر دعا کے واسطے کیونکر اٹھائے ہاتھ
ہے اک جگر پہ ایک دلِ بیقرار پر

وہ ایسے کون ہیں جو راز افشا کرنے والے ہیں
یہی کمبخت آنسو ہیں یہی بیدرد نالے ہیں

کسی نے بن سنور کر پھر قدم باہر نکالے ہیں
ابھی دو چار باقی اور شاید مرنے والے ہیں

نگاہِ ناز کو اک ہم دعا دیتے ہیں کیا ظالم
ترے اس تیر نے کتنے کلیجے چھید ڈالے ہیں

نمودِ حسن ہی صدقہ انہی کا ہیں نہ ہا تو لگا
کبھی تم نے کسی ناشاد کے ارماں نکالے ہیں

کبھی کھچنا کبھی تننا کبھی کچھ چل کے رک جانا
عروسِ تیغ نے تیرے قیامت کے نکالے ہیں

ہم ایسی کارواں میں ہیں جو اک اجڑی ہوئی ٹکڑی ہے
یہاں بانگِ جرس کیسی یہی دو چار نالے ہیں

جو چپ رہیے تو کرتی ہے خموشی خود زباں پیدا
جو کچھ کہیے شہادت کیلئے موجود نالے ہیں

الاماں اُس شوخ سے جو آسماں پہ کہے ۔۔۔ تو ستمگر ہے فقط میں ہوں ستم ایجاد بھی

ہائے کیا تاثیر رکھتی ہے حسینوں کی ادا ۔۔۔ لطف کا کیا ذکر دیتی ہے مزہ بیداد بھی

رنج و راحت ہیں اگر توام تو اک دل اور ہو ۔۔۔ ورنہ مشکل ہے کہ رہئے شاد بھی ناشاد بھی

جس طرف دیکھا ہمیں گلہائے داغ آئے نظر ۔۔۔ سیر کے قابل نہ پایا گلشن ایجاد بھی

ہائے یہ کہنا نہ بھولیگا کبھی اُس شوخ کا ۔۔۔ سچ کہو اختر تمہیں ہے کچھ ہماری یاد بھی

ممتاز احمد رضا آرزو بنیانی

یہ شاعری کے بڑے دلدادہ ہیں زیادہ کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں اسجگہ تھوڑے سے شعر اُن کی طبعزاد لکھے جاتے ہیں ۔

لوٹتی ہے زلف اُس بت کی کمر پہ بار بار ۔۔۔ دیکھکر مجنوں کو لیلیٰ کیسی دیوانی ہوئی

بوئے گل پھولوں سے کرتی ہے گلہ گلزار میں ۔۔۔ تیرے لئے کپڑے پھاڑے میری مفت عریانی ہوئی

دل کی دیکھا دیکھی چوٹی بھی ترے پیچھے پڑی ۔۔۔ وہ تو دیوانہ تھا یہ کیسی تجھ پہ دیوانی ہوئی

صبح اٹھکر روز آتے ہیں تماشے کو حسین ۔۔۔ آرزو کی صورت آئینے کی حیرانی ہوئی

جس کی کلی کلی سے ہمیں ربط تھا کبھی ۔۔۔ صیاد کیا بتاؤں وہ گلزار کیا ہوا

دن بھر تو شادمانہ تھا کوئے یار میں ۔۔۔ ہوتے ہی شام سایۂ دیوار کیا ہوا

پہلے سنگھا کے زلف مجھے لاؤ ہوش میں ۔۔۔ پھر مجھ سے پوچھنا مرے بیمار کیا ہوا

مسعود احمد صاحب ضمیر مینائی

یہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے ہیں ذہانت و طباعی میں حضرت امیر کا نمونہ ہیں۔ ذکاوت غیر معمولی رکھتے ہیں اور فوراً شعر کہہ لیتے ہیں علاوہ عربی فارسی میں استعداد رکھنے کے انگریزی کے بھی ماہر ہیں۔ حضرت امیر انکو کبھی اپنے پاس سے جدا نہیں ہونے دیتے تھے حیدرآباد کے سفر میں بھی یہ ساتھ تھے ممالک متوسطہ برٹش انڈیا میں ملازم ہیں۔ ان کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

آب و تابِ حسن سے کچھ ایسی نورانی ہوئی
آنکھ کا تارا چمک کر صبحِ پیشانی ہوئی

فتنۂ محشر کے پردے میں چھپوگے سمجھ کیا
ہے تمہاری شوخیوں کی چال پہچانی ہوئی

کچھ کو غصے میں اجل کے گھاٹ اتارا یار نے
کشتیِ موجِ فنا وہ چینِ پیشانی ہوئی

[illegible] آئینہ مانگا سنورنے کیلئے
پہلے آئینے سے حاضر میری حیرانی ہوئی

خوش کیا سب کو گلے مل کے تیغِ یار نے
واہ اچھی عید آئی اچھی قربانی ہوئی

پڑ گئی جب وہ نگاہِ شوخ بجلی پر ضمیر
ایسی شرمائی کہ بدلی کی طرح پانی ہوئی